بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ (92) اگست-2025 جلد نمبر 18

Tahreek-e-adab vol-18, issue-92 August 2025

Editor مدیر

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔ جی۔ کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-18(18 جلدنمبر) Year of Publication 2025 سال اشاعت:

Issue August 2025، شمارہ 92۔اگست شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi انور جمال :سرنامہ خطاط

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین : سرورق

200/-Two Hundred rs. per copy دوسوروپے : فی شمارہ

زرسالانہ : دوہزارروپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزارروپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اورانٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زررفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087
State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارانسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرا اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔سچائی کا یقین، زندگی ایک قیمتی موقع، دونوں حالتوں میں صبر
، دشمن میں دوست، صبر کا فائدہ — مولانا وحید الدین خاں — 6

نظمیں: — اسلم عمادی — 14

غزلیں:

نعیم اختر جراءت، مجیب احمد خاں مجیب، ڈاکٹر بختیار نواز — 15

مضامین:

1۔پون کمار: عصری فکر کا شاعر — پروفیسر قدوس جاوید — 18

2۔مولانا آزاد کے تعلیمی معرکے:
ایک تعارف — ڈاکٹر منظور احمد — 21

3۔علامہ شبلی نعمانی: بحیثیت مورخ — ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم — 30

4۔نسائی افسانے کی نئی قراءت:
ایک دستاویزی کتاب — ڈاکٹر گلشن عبداللہ — 50

5۔شکایت ہے مجھے خداوندان مکتب سے — ڈاکٹر منظور احمد — 59

6۔سلام بن رزاق کے افسانوں میں
سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی — شکیلا اختر — 69

7۔علی عباس حسینی کے افسانوں میں سماج
اور اس کے مسائل — عافیہ نگار — 80

8۔اردو غزل کے بدلتے رجحانات — روحی جان — 91

9۔وارث علوی کا تنقیدی رویہ اور		
فراق گورکھپوری کی نظم نگاری	آصف جمال	102
10۔زبانہاری ہندوآریائی وجایگاہ پشتو وسانسکرت		
درآن	محمود مرہون	109
11۔سرپٹ گھوڑا کا تنقیدی مطالعہ	فیضان الرحمٰن	128
افسانے:		
1۔کشکول	وحشی سعید	138
2۔تتلی	نور شاہ	144
3۔کلاسیفیکیشن	نجمہ عثمان	149
4۔نئے افق کا سراغ	واجدہ تبسم گورکو	155

Sachchai ka yaqeen,Zindagi-ek Qimti Mauqa

Dono Haalton mein Sabr, Dushman mein dost, Sabr ka Fayeda, Maut -

Khatma-e-Hayat nahin by Maulana Wahiduddin Khan

مولانا وحید الدین خاں

سچائی کا یقین

موجودہ دُنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس یقین پر قائم ہو کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے اس کے حق ہونے پر اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ اس قسم کا یقین آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔ یہی یقین آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان معتدل طور پر رہے۔ اس کو ذہنی سکون حاصل ہو۔ وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے اور دن کو اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔ اسلام آدمی کو یقین کی یہی نعمت عطا کرتا ہے۔

ایک پہاڑ یا ایک جانور کی یہ ضرورت نہیں کہ وہ دُنیا میں اپنے وَجود کا جواز تلاش کرے ۔مگر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ یہ جانے کے وہ کیا ہے اور کس مقصد کے تحت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں زندگی کا نظریہ (آئیڈیالوجی) کہا جاسکتا ہے۔ فلسفہ اس نظریۂ حیات کی تلاش کا علم ہے۔ مگر پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ مُدت کی تلاش کے باوجود ابھی تک فلسفہ اپنی تلاش کا جواب نہ پاسکا۔ فلسفہ اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر انسان کو صرف تشکیک اور بے یقینیت دینے میں کامیاب ہوا۔ فلسفہ کے بعد سائنس کا درجہ آتا ہے مگر سائنس نے پیشگی طور پر یہ مان لیا ہے کہ وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دے سکتی ہے، کُلی حقیقت تک پہنچنا سائنس کے لئے ممکن ہی نہیں۔

گویا سائنس نے خود ہی یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ مقابلہ کے میدان میں اُترنے کی سرے

سے اہل نہیں ۔اب آخری چیز جس سے اس معاملہ میں رَجوع کیا جائے وہ مذہب ہے ۔یہاں بھی منظر زیادہ مختلف نہیں۔ بظاہر دُنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں مگر اسلام کے سوا تمام مذاہب کی حالت بلا استثناء یہ ہے کہ ان کو نہ علمی تائید حاصل ہے اور نہ تاریخی اعتباریت ۔ان مذاہب کی مقدس کتابیں تحریف کی بنا پر صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتوں کا مجموعہ بن گئی ہیں ۔

اسی طرح ان کے تاریخی حالات اتنے کم معلوم ہیں کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے ان کی سچائی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔اس طرح یہ تمام مذاہب بھی عملی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ انسان کو وہ سچائی دے سکیں جس پر وہ کامل یقین کے ساتھ قائم ہو جائے۔

افکار کے اس جنگل میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف کامل سچائی کا حامل ہے بلکہ واقعاتی اعتبار سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی تاریخی اعتباریت میں کوئی شبہ نہیں ۔اسلام انسان کے لئے ایک نادر تحفہ ہے ۔اسلام ایک ایسا دین ہے جو غیر مشتبہ سچائی کا حامل ہے۔ جو کُلّی صداقت کا سرمایہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے ۔جو اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ انسان اس یقین کے ساتھ اس کو اختیار کر سکے کہ اس نے سچائی کو پا لیا ہے جس کی تلاش اس کی فطرت میں پیشگی طور پر موجود تھی ۔

اسلام ایک متلاشی روح کا حقیقی جواب ہے ۔ وہ انسان کی شخصیت کی تکمیل ہے ۔ وہ انسان کو وہ غیر متزلزل یقین دیتا ہے جس کے سہارے وہ دُنیا میں زندہ رہ سکے ۔اسلام آدمی کی قبل از موت زندگی کو بھی بامعنی بناتا ہے اور اس کے بعد از موت زندگی کو بھی ۔

زندگی ایک قیمتی موقع

زندگی اگر صرف وہی ہے جو موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو ملتی ہے تو بلا شبہ وہ اتنی زیادہ بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی چیز اور کوئی نہیں۔ انسان لامحدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں وہ اپنی ان صلاحیتوں کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کر پاتا کہ وہ مر جاتا ہے۔ انسان کے اندر تمنّاؤں اور آرزوؤں کی ایک کائنات بسی ہوئی ہے مگر کوئی بھی

شخص اپنی ان تمنّاؤں اورآرزوؤں کی تکمیل اس دنیا میں نہیں پاتا۔تمام موجودات اور مخلوقات میں انسان واحد مخلوق ہے جو مستقبل کا تصوّر رکھتا ہے۔مگر تمام انسان ابھی اپنے حال میں ہوتے ہیں کہ ان کی دینوی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے،بغیر اس کے کہ انہوں نے اپنے مستقبل کو پایا ہو۔ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کامیاب زندگی کا حریص ہے ،مگر یہاں کوئی بھی انسان اپنی کامیابی کو نہیں پاتا۔ بظاہر انسان کے لئے صرف یہ المناک انجام مقدر ہے کہ وہ اپنی کامیابی کی تاریخ بنانے سے پہلے اس دُنیا سے چلا جائے۔

اسلام اس اَندھیرے میں انسان کے لئے ایک روشنی ہے۔اسلام کا جنّت کا تصّور آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ناکامی کو کامیابی سے بدلے۔کس طرح وہ اپنے خوابوں کے اس مستقبل کا مالک بنے جہاں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل (Fulfillment) کو پاسکے ۔حقیقت کا یہ انکشاف جو اسلام کے ذیعہ کیا گیا ہے وہ ہر آدمی کے لئے زندگی کو ایک قیمتی موقع بنادیتا ہے۔اب ہر آدمی ایک مطلوب منزل دریافت کرلیتا ہے جس کی طرف وہ چل سکے۔ ہر آدمی ایک ایسے نشانے کو جان لیتا ہے جس کو وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز توجہ بنالے۔

دونوں حالتوں میں صبر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عجبت من قضاء اللہ عزوجل للمؤمن ان اصابہ خیر حمد ربہ شکر وان اصابتہ مصیبہ حمد ربہ وصبر المومن یوجر فی کل شئی (مسند الامام احمد بن حنبل ا / ۱۷۳)۔یعنی مومن کے معاملے میں اللہ کا فیصلہ کیسا عجیب ہے۔ اگر اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔اس طرح مومن کو ہر چیز میں اجر ملتا رہتا ہے۔

مومن سے مُراد وہ انسان ہے جس کا شعور پوری طرح بیدار ہوچکا ہو،جس کی سوچ اس حد تک ترقی کرچکی ہو کہ وہ ہر پیش آنے والی صورتحال پر مثبت جواب (Posivite Response) دے سکے۔وہ قریبی حالات سے اوپر اُٹھ کر حقائق کو دیکھنے والا بن

چکا ہو۔یہی وہ انسان ہے جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں کیا گیا ہے۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو کوئی پسندیدہ چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑتا کہ یہ اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے قائم کردہ نظام کی بنا پر ممکن ہوا ہے ۔ یہ چیز اس کو حقیقت پسند بناتی ہے اور اس کو نظام خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔اسی طرح اگر اس کو کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آئے تب بھی اس کا ترقی یافتہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس کا ذہنی سکون نہ ٹوٹے۔ وہ فریاد یا شکایات کے بجائے صبر وتحمل کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔

موجودہ دُنیا میں یہ مزاج آدمی کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔اس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ حالات کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہے۔وہ ہر نہیں میں اپنے لئے ایک کا راز دریافت کرلے ۔اس کی زندگی کبھی تعطل سے دوچار نہ ہو ۔ اس کی اُمیدوں کا چراغ کبھی بجھنے نہ پائے، وہ اس کو ہمیشہ روشنی اور حرارت دیتا رہے۔

دشمن میں دوست

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے---اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں ۔اور بھلائی اور بُرائی دونوں برابر نہیں،تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی ، وہ ایسا ہوگیا جیسے کوئی دوست قرابت والا ۔(حم السجدہ ۳۳ ۔۳۴)

کسی سے دشمنی ہوجائے یا کسی آدمی کو ایک شخص اپنا دشمن نظر آئے تو اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہ میرا دشمن ہے۔اس کا حل صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو تباہ کردیا جائے ۔مگر اسلام ایسے معاملے میں بھی ایک اُمید افزاء پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ تمہارے دشمن کے اندر تمہارا ایک دوست چھُپا ہوا ہے۔اس دوست کو دریافت کرو، اور پھر تمہارا دشمن تمہارا قریبی ساتھی بن جائے گا۔

دوستی یا دشمنی کوئی پیدائشی صفت نہیں۔کوئی آدمی پیدائشی طور پر کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔اگر ایک شخص آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کی ایک مصنوعی حالت ہے۔آپ اپنے میٹھے بول اور اپنے حُسن سلوک سے اس کو ایک نیا انسان بنا سکتے ہیں۔آپ اپنے دوستانہ عمل سے اس کو اس حد تک بدل سکتے ہیں کہ آپ کے خلاف اس کی ضد اور نفرت ختم ہو جائے۔جو شخص اب تک بظاہر آپ کا غیر بنا ہوا تھا، وہ آپ کا اپنا بن جائے۔

یہ ہر انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں بہتر امکانات کی فہرست اتنی لمبی ہے جو دُشمن تک کو دوست کے خانہ میں درج کئے ہوئے ہے۔یہ اسلامی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھے، وہ مخالف انسان میں بھی اپنا ایک موافق انسان پالے۔یہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے نہ کہ سادہ طور پر محض ایک مذہبی عقیدہ۔

صبر کا فائدہ

ایک حدیث قُدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے فرمایا□ إذا ابتلیت عبدی بحبیبتیہ فصبر عوضتہ منھما الجنۃ۔(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۱۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں سے آزماتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو مَیں اس کو اس کے بدلے جنّت دے دیتا ہوں۔روای کہتے ہیں کہ وہ دو محبوب چیزوں سے مُراد دو آنکھیں ہیں۔دو آنکھوں کی محرومی پر صبر کا جو انعام کسی کو خُدا کی طرف سے ملتا ہے اس کا تعلق صرف جنّت سے نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسے انسان کا انعام موجودہ دُنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کی آخری اور تکمیلی صورت یہ ہے کہ اس کو جنّت میں داخلہ مل جائے۔ایسا انسان دُنیا میں نابینا ہونے کے باوجود کامیاب رہتا ہے اور آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ بینا بھی اور کامیاب بھی۔

دونوں آنکھوں کی محرومی پر جب ایک آدمی صبر کر لے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کی اندرونی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔اس کی داخلی شخصیت میں ایک نیا نفسیاتی عمل شروع

ہوجاتا ہے جو اس کے اندر چھُپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کردیتا ہے۔اس کے دماغ کی وہ مخصوص کھڑکیاں کھُل جاتی ہیں جو خالق فطرت نے صرف اس لئے اس کے اندر رکھی ہیں تا کہ وہ ایمرجنسی کے وقت اس کے کام آئیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے خانے ایسے ہیں جو عام حالات میں بالکل بند رہتے ہیں۔وہ صرف اس وقت کھلتے ہیں جب کہ انسان کسی ہنگامی حالت سے دوچار ہوجائے۔صبر انہیں بند دروازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ایسے حادثے کے موقع پر جو لوگ غم اور فریاد کا شکار ہوجائیں،ان کے دماغ کے یہ ہنگامی خانے بدستور بند پڑے رہیں گے۔اس کے برعکس جو لوگ ایسے موقع پر صبر کا مثبت رسپانس (Positive response) دیں وہ فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دیتے ہیں ۔اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم ہوکر وہ داخلی آنکھوں کی صورت میں اس کا بدل پالیتے ہیں۔راقم الحروف نے خود اپنی زندگی میں کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے۔مثال کے طور پر بھوپال کے جناب الطاف احمد صاحب طویل عرصے سے بینائی سے محروم ہیں مگر وہ اپنے تمام کام معمول کے مطابق اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔اسی طرح امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات ڈاکٹر ایوب لبنانی سے ہوئی۔وہ ٹمپل ٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اپنے تمام کام بالکل معمول کے مطابق انجام دیتے ہیں۔حتیٰ کہ مشین کی مدد سے وہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

آنکھ انسان کی تمام قیمتی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب آنکھ جیسی قیمتی چیز سے محرومی پر صبر سے انسان کو نئی زندگی ملتی ہے تو دوسری محرومیوں پر صبر سے بدرجۂ اولیٰ اس کو یہ چیز حاصل ہوگی۔صبر ایک ایسی نعمت ہے جو کسی انسان کی ہر محرومی میں اس کا مددگار رہے۔صبر کسی انسان کے لئے کھونے کو دوبارہ پانا بنا سکتا ہے۔

موت خاتمۂ حیات نہیں

موجودہ دُنیا میں انسان کے ساتھ جو حادثات پیش آتے ہیں ان میں سب سے بڑا حادثہ

موت کا حادثہ ہے۔موت ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا فیصلہ کن زلزلہ ہے جس سے بچنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ۔کوئی بھی تدبیر اتنی طاقتور نہیں جو موت کو ٹالنے میں کارآمد ہو سکے ۔موت کا شکار ہر آدمی لازمی طور پر ہوتا ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ بے زور ہو یا زورآور۔یہی وجہ ہے کہ ہر دَور کا انسان موت کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے سوچتا رہا ہے۔موت کی یاد ہر آدمی کی خوشیوں کے چراغ کو بجھا دیتی ہے۔ ہر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا پیدا کرنے والے نے مجھ کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ میں چند سال زندہ رہ کر ختم ہو جاؤں، ایک محدود مُدت دُنیا میں گزار کر اس طرح یہاں سے جاؤں کہ میری کوئی بھی کامیابی موت کے اس سفر میں میرے ہمراہ نہ ہو۔

اس معاملے میں اسلام ہر انسان کے لئے اُمید کا ایک چراغ ہے۔اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جو تخلیقی منصوبہ انسان پر منکشف کیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں،موت دراصل ایک درمیان وقفہ ہے جس کے بعد آدمی اپنے اگلے مرحلۂ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔اس دوسرے مرحلۂ حیات میں انسان اسی طرح ایک زیادہ کامل اور وسیع دنیا میں جئے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں نسبتاً بہت مختصر اور کمتر زندگی گزار رہا تھا۔اسلام کے ذریعہ یہ خبر جو انسان کو دی گئی ہے وہ ہر مرد و عورت کے لئے زندگی کا نیا پیغام ہے۔اس خبر کی صورت میں آدمی اس امکان کو دریافت کرتا ہے کہ وہ اگلی دنیا کے قوانین کو جانے اور اس کے مطابق زندگی گزارے تا کہ وہ موت کے بعد دوبارہ ایک نئی اور زیادہ بہتر زندگی پالے ۔اس تخلیقی منصوبہ سے بے خبری انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں مایوسی میں مبتلا کرتی ہے مگر جب وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جان لے تو اس کے بعد اس کے سامنے زندگی کا نیا وسیع تر دروازہ کھل جاتا ہے۔وہ بظاہر اپنی محرومی میں ایک نئی یافت کا راز پالیتا ہے۔

ایک انوکھی خوشخبری

قرآن کی سورۃ نمبر ۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا□ ’’تم

کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔'' (الزمر ۵۳ ﴿﴾)

قرآن کی یہ آیت انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ موجودہ دُنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہر آدمی سے طرح طرح کی کوتاہیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ان گناہوں کا انجام اگر لازمی طور پر بھگتنا ہوتو انسان کے لئے زندگی کتنی بڑی مصیبت بن جائے۔ مگر خدا کی کتاب انسان پر یہ راز کھولتی ہے کہ اس کے لئے اس معاملہ میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ گناہوں سے معافی کا یہ راز کیا ہے۔ وہ ہے گناہ پر شرمندگی اور اللہ کی طرف دوبارہ رجوع کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کچھ اعمال کو گناہ قرار دیا ہے اسی طرح اس نے اس دنیا میں اِمکان بھی رکھ دیا ہے کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد آدمی اپنے کو اس سے پاک وصاف کر سکے۔ وہ خدا کی دنیا میں ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے داخل ہو۔

قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے لئے یہ عجیب امکان بھی رکھا ہے کہ اس کا گناہ بدل کر اس کے لئے نیکی بن جائے (الفرقان ۷۰ ﴿﴾)۔ وہ اس طرح کہ گناہ کے بعد جب آدمی شرمندہ ہوتا ہے اور گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ گویا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جب کہ اس کا گناہ اس کے لئے ایک نیکی کا سبب بن گیا۔ ابتداًا گر وہ خدا سے دُور ہوا تھا تو بعد کے مرحلہ میں وہ خدا سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اس کی یہ روش خدا کو اتنا زیادہ پسند آتی ہے کہ اس کے گناہ کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔

خدا کا یہ قانون جو قرآن کے ذریعہ کھولا گیا ہے انسان کے لئے ایک عجیب نعمت ہے۔ وہ انسان کے لئے لازوال تسکین کا سرمایہ ہے۔

☆☆☆

نظمیں

Aslam Imadi (New Jersey, U.S.A.)
cell-001-732-207-9739
اسلم عمادی (نیوجرسی، امریکہ)

حصار منبر و محراب

ہنستے رہیں گے لب یہ عنایت اسی کی ہے
برسیں گے ہم پہ پھول یہ الفت اسی کی ہے
میں کیا ہوں ایک قطرہ ءمحر کمال شوق
ہوں آج موجزن تو یہ قدرت اسی کی ہے
مجھ سے تمام شہر میں ہے گرمی ء حیات
میرے بدن پہ ساری حرارت اسی کی ہے
ہم کو بنا دیا ہے ہواؤں کا حکمراں
ہم پر اتر رہی ہے جو طاقت اسی کی ہے
ہم کیا تھے صرف رنگ بصارت کا آئینہ
ہم میں جو آ گئی ہے بصیرت اسی کی ہے

☆☆☆

آگ پہلو میں جلے

آگ پہلو میں جلے
لہرا اٹھے اٹھ کر گرے اور چلی جائے
سمندر میں کہیں
دھوپ جنگل میں پھنسے ایسے
کہ ہم لوگوں کو احساس کا اک پل نہ ملے
اور
جب رات کی سوئی ہوئی آنکھیں جاگیں
چاند مٹی بنے اور
بانس کی جھاڑی میں گرے یوں کہ
کسی نوک میں جا کر پھنس جائے
چڑیا
سب خوف سے گانے لگیں
حمد وثنا!!
آگ پہلو میں جلے
اور کوئی۔۔۔اور کوئی اپنا ہم آواز نہ ہو
گم کنویں میں ہو صرف سینہ مرا
میری تنہائی کے جنگل میں
نہ آئے کوئی، نہ کوئی سانس گرے
سانپ درختوں سے کہیں
سارے جنگل میں گھنا شور
میری تازہ نئی پتیوں کا
گرچہ ہر سمت وہی آگ کا خوف
آگ پہلو میں جلے
اور ہوا بھڑکائے

☆☆☆

غزلیں

Naim Akhtar "Jurrat" (Varanasi)
cell-9554836672
نعیم اختر جراءتؔ (وارانسی)

(1)

کام دنیا کا خوب چلتا ہے
اتنا تحفہ زمیں سے ملتا ہے

سنتے رہتے ہیں بھوک کا سنگیت
جب بھی ہانڈی میں انّ ابلتا ہے

کیا کہیں آگ ہے کہ پانی ہے
پلکوں پہ جو چراغ جلتا ہے

دہر لگتا ہمیں جوا گھر سا
ہر کھلاڑی ہی ہاتھ ملتا ہے

راستے سب بھرے ہیں پھسلن سے
دیکھئے کون اب سنبھلتا ہے

خون اپنوں کا ہو کہ غیروں کا
آہ! جراءتؔ کا دم نکلتا ہے

☆☆☆

(2)

باعث فتنہ ہے زباں بے رنگ
کب تلک دیکھیں یہ سماں بے رنگ

رنگ چہرے کا اڑ ہی جاتا ہے
پڑھ کے خبروں کی سرخیاں بے رنگ

زینہ رنگین ہے جہنم کا
اور جنت کی سیڑھیاں بے رنگ

ہے فضاؤں میں دھول اور دھواں
زمیں بے رنگ آسماں بے رنگ

موسموں نے بھی کی سیاست کیا
گرمیاں اور سردیاں بے رنگ

امن پامال شہر شہر میں ہے
عدل کی دیکھیں کرسیاں بے رنگ

موئی اے سی ہے اب دریچوں پر
دیکھیں اکثر یہ کھڑکیاں بے رنگ

ننھے منے پہ بوجھ بستے کا
یہ کتابیں یہ کاپیاں بے رنگ

کچھ تو جراءتؔ کریں ادب کے لئے
ہوں نہ غزلیں، رباعیاں بے رنگ

☆☆☆

Mujeeb Ahmad Khan "Mujeeb"
(Varanasi)cell-9369846044

مجیب احمد خاں مجیبؔ (وارانسی)

ہر صبح محبت ہے مری شام یہی ہے
بکتا ہوں، خریدو گے، مرا دام یہی ہے
تم پریم کہو، پیار کہو، عشق کہو یار
الفاظ ہوں کچھ بھی، مرا پیغام یہی ہے
ہر دل میں جلاتا ہوں میں الفت کی قندیلیں
آتا نہیں کچھ اور مرا کام یہی ہے
ہم اہلِ محبت سے سدا ہاری ہے نفرت
گو بکتی بازاروں میں سر عام یہی ہے
پرکھوں نے پکارا تھا اسی پریم کو امرت
جو رب نے رسولوں کو دیا جام یہی ہے
اتنا مرے اشعار میں ہے ذکر محبت
اب لوگ سمجھتے ہیں مرا نام یہی ہے
بس پیار کے دامن میں ہی سکھ چین ہے سب کا
سچ پوچھو تو بس راحت و آرام یہی ہے

☆☆☆

غبارے میں ہوا بھرتی ہی جائے
گھڑی پھٹنے کی جب نزدیک آئے

غریبی اور بھی پینگیں بڑھائے
امیری بس اسے جھولا جھلائے

نظر پھیریں تو وہ آنکھیں دکھائے
اسے دیکھوں تو وہ نظریں چرائے

چھڑی ہے اب بحث جمہوریت پر
کہ اس کو کون سولی پر چڑھائے

منانے میں اسے دو رات بیتی
پڑی ہے وہ ابھی تک منھ پھلائے

وزارت بنٹ رہی ہے یہ بتا کر
کہ اب کے کون کس لنگر سے کھائے

☆☆☆

Dr. Bakhteyar Nawaz (Varanasi)

cell-9336900864

ڈاکٹر بختیار نوازؔ (وارانسی)

بستی بستی گھوم رہا تھا میں جس کی تصویر لئے
مجھ کو ملا ہے آج وہ لیکن آنکھوں میں تحقیر لئے

سلگ رہا ہے لمحہ لمحہ ہر جانب بارود کا ڈھیر
میرا بچہ گھوم رہا ہے لکڑی کی شمشیر لئے

قید کیا تھا شب بھر میں نے جگنو اپنے ہاتھوں میں
آنکھ کھلی تو گھوم رہا ہوں زخموں کی تنویر لئے

خود سے بھاگ کے آخر کتنی دور تلک جا پاؤں گا
دنیا سامنے آ جاتی ہے رشتوں کی زنجیر لئے

لوگ سبھی موجود وہاں تھے دنیا کی دولت کے ساتھ
محفل میں اک میں تھا اپنے لفظوں کی جاگیر لئے

تقدیروں کا مالک ہم کو دیکھ رہا ہے حیرت سے
دوار پہ پنڈت کے جب پہنچا ہاتھوں کی تحریر لئے

صدیوں سے خوابوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں لوگ نوازؔ
ملتا کوئی نہیں ہے لیکن خوابوں کی تعبیر لئے

☆☆☆

(2)

میں اپنے واسطے الجھن تلاش کرتا رہا
کہ خود ہی شہر میں دشمن تلاش کرتا رہا

چمن اجڑ گیا منھ زور آندھیوں کے سبب
میں شاخ شاخ نشیمن تلاش کرتا رہا

یہاں تو لفظوں کی جادوگری کمال ہوئی
میں شاعری میں عبث فن تلاش کرتا رہا

تمام عمر یہی ایک جرم تھا میرا
میں زندگی میں نیا پن تلاش کرتا رہا

وہ خود پرستی میں بینائی کھو چکا تھا نوازؔ
میں جس کے واسطے درپن تلاش کرتا رہا

☆☆☆

Pawan Kumar : Asri Fikr ka Shair by Prof. Quddus Javed (Ex. HOD Urdu University of Kashmir,Srinagar) cell-9419010472

پروفیسر قدوس جاوید (سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی، سرینگر)

پون کمار: عصری فکر کا شاعر

پون کمار کی شاعری ذات، زندگی اور زمانہ کے گہرے شعور کی شاعری ہے۔ شعری مجموعوں ''وابستہ'' اور ''آہٹیں'' کے خالق پون کمار کی شاعری کی سنجیدہ قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پون کمار اپنی ذات کی کیفیات و واردات اور خارجی زندگی کے تجربات و محسوسات کی موزوں و متوازن آمیزش سے اپنے اشعار کو وجود میں لاتے ہیں۔ اسی لیے پون کمار کی شاعری میں بدلتے ہوئے زمانے میں انسانی رشتوں اور قدروں کی شکستگی کا اظہار بے حد پُرتاثیر انداز میں ہوتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے

۔

آشنا ہو کر بھی اس نے مجھ کو پہچانا نہ تھا
اس کے اس برتاؤ کا کچھ مجھ کو اندازہ نہ تھا
پھر بھی اس رشتے کو میں نے ٹوٹ کر چاہا پونؔ
وہ کہ جس رشتے سے میرا کوئی بھی ناطہ نہ تھا

پون کمار کے معاصر شاعروں میں عرفان صدیقی ، احمد مشتاق ،شہپر رسول ،فرحت احساس ،رفیق رازؔ، خالد آبادی اور عرفان عارف تک شامل ہیں۔ ان معاصر شعراء کی طرح پون کمار بھی کسی مخصوص رجحان یا تحریک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کلام میں موضوع کے اعتبار سے کہیں کلاسکیت تو کہیں جدیدیت اور مابعد جدیدیت

سے رشتہ رکھنے والے اشعار ملتے ہیں ۔مثلاً ان اشعار میں پون کمار کی فکری جہتوں کی رنگا رنگی دیکھی جا سکتی ہے،

درد دب جائے کسی طور نہ آنسو آئے
جذبۂ دل یہ بتا کس طرح قابو آئے

تیرے احساس میں ڈوبوں تو مہک جائے دماغ
تجھ کو سوچوں تو میرے جسم سے خوشبو آئے

دھوپ میں نہائے تھے روشنی کے پہرے تھے
پھر بھی ان درختوں کے سائے کتنے گہرے تھے

ان دنوں تو خوشیوں کے رنگ بھی ہیں افسردہ
اُن دنوں اداسی کے رنگ بھی سنہرے تھے

کسی نے رکھا ہے بازار میں سجا کے مجھ
کوئی خرید لے قیمت مری چکا کے مجھے

پون کمار کے یہاں چھوٹی اور بڑی مختلف بحروں میں شعر کہنے کا ہنر ملتا ہے ۔چھوٹی بحر کی ایک غزل کے ان اشعار میں کس طرح بڑی باتیں کہی گئی ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لہو آنکھوں میں جمتا جا رہا ہے　　یہ دریا خشک پڑتا جا رہا ہے
جسے دل میں اترنا چاہیے تھا　　وہی دل سے اترتا جا رہا ہے

ایسے اشعار میں عصری فکر کی تازہ کاری بھی ہے اور تغزل کی خوبیاں بھی ۔ایسے اشعار پون کمار کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں جن میں نئے تجربات کو تغزل کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔اکثر پون کمار کے اشعار میں نارسائی اور محرومی کے مضامین ملتے ہیں جو آج کے انسان کا مقدر ہیں۔مثلاً۔

کیا زندگی نے رکھی سوغات میرے حق میں
ہر جیت اس کو حاصل ہر مات میرے حق میں
یوں مشترک تھے ہم سب ہر فرد تھا مساوی
پھر بھی ہیں سارے مشکل حالات میرے حق میں

لیکن پون کمار کے یہاں یاسیت کے ساتھ ساتھ رجائیت کے عناصر بھی بھرے پڑے ہیں۔

وہ لمحہ جس سے رنجِ زندگی نکھرا ہوا سا کبھی ٹھہرا ہوا ہے تو کبھی گزرا ہوا سا
میں اپنی ہار جیت کی پرواہ کیے بغیر کرتا رہا مقابلہ آرائی شعر سے
پھر اور لطف آپ کو جینے میں آئے گا لمحہ تلاش کیجیے صدیوں کے ڈھیر سے

پون کمار کے یہاں لفظ کی قوت کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے اشعار میں ایسے الفاظ لاتے ہیں جو عصری زندگی کے ڈسکورسز کے لازمہ ہیں۔ الفاظ کا ایسا استعمال اور برتاؤ پون کمار کو مابعد جدید شاعروں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پون کمار اپنی ذات اور زندگی کی تلخ اور شیریں سچائیوں کے انکشاف کا شاعر ہے۔

اردو میں منچندہ بانی اور شہریار کے یہاں جو نادر و نایاب مضمون و معنی آفرینی کی جو خوبیاں ملتی ہیں پون کمار کے یہاں انہیں مزید ترقی یافتہ صورتوں میں برتنے کا رجحان ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پون کمار کی شاعری اکیسویں صدی کی بدلتی ہوئی سماجی و ثقافتی قدروں کی ترجمان ہے۔ غزل کے مزاج سے گہری وابستگی کے سبب پون کمار کی غزلوں میں فکری حرارت بھی ہے اور جمالیاتی تمازت بھی۔ اسی لیے پون کمار کی شاعری غزل کے تازہ ترین لسانی اور شعری رویوں کا ساتھ دیتی ہے اور یہی پون کمار کی شاعری کا انفراد بھی ہے اور امتیاز بھی۔

☆☆☆

Maulana Azad ke Talimi Marke : Ek Tarruf by Dr. Manzoor Ahmad (Assot. Prof. Dept. of Education, Kashmir University,Srinagar)cell-7006098266

ڈاکٹر منظور احمد (ایسوشیٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ اف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف کشمیر)

مولانا آزاد کے تعلیمی معرکے: ایک تعارف

تلخیص: مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت میں ہمیں بیک وقت ایک عالم دین، سیاست دان، صحافی، مصلح، دانشور، انشا پرداز، ادیب وخطیب کے نمائیاں کردار ملتے ہیں۔ ان سبھی شخصی پہلوں کا ان کے تعلیمی نظریات پر دور دور تک ایک گہرا اثر پڑا ہے۔ چونکہ ان کے محرکات ومتاثرات کا ماخذ کبھی مذہب تو کبھی سائنس، کبھی فلاسفی تو کبھی تاریخ رہا، اُنکی تعلیمی ترجیہات میں ہمیں ایک مکمل شخصیت سازی کا تصّور بار بار ملتا ہے۔ تعلیمی معاملات میں وہ روایتی طرز اپنانے کو ہمیشہ حدف تنقید کیا کرتے اور عصری اور موجودہ تقاضوں کو مدنظر رکھ کر وہ انقلاب آفرین تبدیلیوں کے ہمیشہ دعویدار رہے ہیں۔ مولانا آزاد کا خالص تصورِ تعلیم، 'ماضی کا ادراک' حال کی بصیرت' اور' مستقبل کی آگہی' رہا ہے۔ انہوں نے ایسی تعلیم کو سراہا جو سائنسی تحقیقات اور بھاری صنعتوں کے شایان شان ہو۔ البتہ یہ بات مسّلمہ ہے کہ آزاد نے سائنسی، تیکنیکی اور مادی ترقی کو مذہبی اور اخلاقی اقتدار کے تابع کرنا چاہا۔ انہوں نے اُس تعلیمی نظام کی وکالت کی جسمیں تخلیق، تحقیق، استدلال، تیکنیک اور اقدار کا فروغ ممکن ہو۔ نصاب کی بات ہو یا تعلیمی تصورات وترجیہات کا معاملہ ہو، تخلیقی وثقافتی اداروں کے کھولنے یا پھر اساتذہ کی تربیت وترقی کا مشن، ہر جگہ انکا ہدف فرد وقوم کی ترقی رہا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہیکہ مولانا آزاد نے ملک کیلئے جو نظریہ تعلیم پیش کیا وہ آج کے اس متغیر دور میں بھی اپنی معونیت وافادیت رکھتا ہے۔

کلیدی الفاظ: تعلیم، ادراک، بصیرت، تحقیقات، تصورات، سفارشات، ثقافتی عروج۔

مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے آنکھ کھولی تو مکہ معظمہ میں لیکن صحیح معنوں میں اُن کو نگاہ جو ملی، ہندوستان میں ملی۔ انہوں نے ادبی علمی، سماجی، تعلیمی، سیاسی غرض کہ زندگی کیہر میدان میں اپنا خاصہ کردار نبا کر اپنے تخیلی و تخلیقی اثاثے کا بھر ملا اظہار کیا۔ مذہب کی بات ہو یا فلاسفی کی یا پھر تاریخ یا سائنس، غرض ہر ایک مضمون میں انکی اپنی طبع آزمائی قابل رشک رہی۔ اُن کی ہمہ گیر شخصیت میں ہمیں بیک وقت ایک عالم دین، سیاست دان، صحافی، مصلح، دانشور، انشا پرداز، ادیب و خطیب کے اوصاف ملتے ہیں اور ان سبھی شخصی اوصاف کا ان کے تعلیمی نظریات پر گہرا اثر پڑا۔ ان کی علمی، ادبی و تعلیمی کارناموں کو سمجھنے کی خاطر خود آزاد اور اسکی وسعتوں اور اونچائیوں کا احاطہ بہت ضروری ہے۔ چونکہ ان کے محرکات و متاثرات کا ماخذ کبھی مذہب تو کبھی سائنس، کبھی فلاسفی تو کبھی تاریخ رہا، اُنکی تعلیمی ترجیہات میں ہمیں ایک مکمل شخصیت سازی کا تصوّر بار بار ملتا ہے۔ لسان الصدق، الحلال و البلاغ جیسے جریدوں کی بدولت انہوں نے ادبی و علمی حلقوں سے وابسطہ لوگوں کو اپنی مہارت و آگہی سے حیراں کیا۔ اسے ہم اُردو صحافت کی پختگی کہیں یا سنگ میل، مولانا آزاد کی تحریر و تقریر کسی شعلہ بیانی سے کم نہیں ہوا کرتی۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب وہ تقریر کرتے تو الفاظ ان کے تابع رہتے تھے اور اس چیز کا اعتراف حسرت موحانی نے کچھ یوں کیا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر | نظمِ حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

غبار خاطر، انڈیا ونز فریڈم، تزکرہ، ترجمان القرآن مولانا ازاد کی شاہکار تخلیقات میں سے ہیں۔ تذکرہ سے پہلے ابتدائی دور کے اُنکے تعلیمی ترجیہات اور سفارشات جریدہ الہلال اور البلاغ میں رقم ہیں جہاں پر بات ہوئی مدرسہ کی، درس و تدریس اور تعلیمی نصاب کی۔ غبار خاطر جو کئی سارے خطوط کا مجموعہ ہے، کو انکے علمی و ادبی کارناموں میں خاص طور سے گنا جاتا ہے۔ بحثیت وزیر تعلیم ان کا یہ عزم رہا کہ تعلم و

تعلیم کی ایسی پختہ بنیاد ڈالی جائے جس پر آنی والی نسلیں اک روشن مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکران کا حدف نسلوں کی تعمیر واصلاح رہا۔ ان کا یہ یقین قوی رہا کہ جب تک ہماری قوم تعلیم سے روشناس نہ ہوگی تب تک زمانے سے قدم ملا کر چلنے کی اہل نہ ہوگی۔

تعلیمی معاملات میں وہ روایتی طرز اپنانے کو ہمیشہ حدّف تنقید کیا کرتے اور عصری اور موجودہ تقاضوں کو مدنظر رکھ کر وہ انقلاب آفرین تبدیلیوں کے ہمیشہ دعویدار رہے ہیں۔ مولانا آزاد کا خالص تصور تعلیم 'ماضی کا ادراک' حال کی بصیرت اور مستقبل کی آگہی رہا ہے۔ انہوں نے ایسی تعلیم کو سراہا اور سفارش کی جو سائنسی تحقیقات اور بھاری صنعتوں کے شایان شان ہو۔ ہاں یہ بات ضرور ہیکہ آزاد نے سائنسی، تکنیکی اور مادی ترقی کو مذہبی اور اخلاقی اقدار کے تابع کرنا چاہا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان کی طرح آزاد بھی دائیں ہاتھ میں قرآن تو بائیں ہاتھ میں سائنس کو دیکھنا چاہتے تھے۔ غرض کہ انہوں نے ایک مکمل نظام حیات کے حصول میں مذہب اور تعلیم کے مشترکہ کردار کی اہمیت پر زور دیا۔ مولانا صرف مشاورتی خاکہ پیش کرنے کے ہی قائل نہیں تھے بلکہ عملی اقدامات پر اپنی سرگرمیاں مرکوز رکھتے تھے۔ انڈین انسٹیچوٹ آف ٹیکنالوجی، انڈین انسٹیچوٹ آف سائینس اور یونیورسٹی گرانٹس کمشن کا قیام جیسے کارنامے قابل ذکر بھی ہیں اور قابل ستائش بھی۔ انڈین کونسل فار ایگریکلچرل اینڈ سائنٹفک ریسرچ ،انڈین کونسل فار انڈسٹریل ریسرچ جیسے اداروں کا قیام اُنکی کاوشوں و کامرانیوں کا نتیجہ رہا۔ سنگیت اکادمی ، ساہتیہ اکادمی، للت اکادمی جیسے ثقافتی اداوں کا قیام مولانا آزاد کی سفارشوں سے ہی ممکن ہوا۔ تعلیم کے تئیں ان کے بالغ نظریہ اور گراں قدر خدمات کے پیش نظر قومی نظام تعلیم کا کام ان کے ہی سپرد کیا گیا۔ ہمائیوں کبیر نے اپنی کتاب " ہندوستان میں نظام تعلیم " کے انتساب میں یہ لکھا کہ :

"ابوالکلام نے مہاتما گاندھی جی اور رابندرناتھ ٹائیگور کے ساتھ ہمارے قومی نظام تعلیم کی

تشکیل میں اہم حصہ ادا کیا تھا"۔

دیکھا جائے تو کبیر کا اعتراف بالکل صحیح تھا۔مولانا کے نزدیک تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی بنا پر ہندوستان جیسے ملک کو دنیا کی ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کی صف میں لایا جاسکتا ہے۔ چونکہ مولانا انگریزی نظام تعلیم اور اسکے حقیر مقاصد سے بالکل آشنا تھے، انہوں نے اپنی نگاہ نوجوانوں کی ذہنی بیداری اور انہیں آئندہ زندگی میں خود کفیل بنانے پر مرکوز کی۔مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی ذہنی بیداری، اتحاد و ترقی، مذہبی رواداری اور عالمی اخوت جیسے بڑے مقاصد پر مبنی ہے۔ان کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے پر مرکوز رہی۔ایک طرف عالمِ دین اور دوسری طرف مولانا چونکہ مشرقی اقدار کے عالمبردار ٹھریے، انہوں نے سائنس اور مغربی تکنیکی تعلیم کو فرد و ملک کی ترقی کیلئے نہایت ہی اہمیت کا حامل سمجھا۔ چونکہ مولانا آزاد فن تعلیم و تربیت اور پورے تعلیمی نظام پر حکیمانہ اور دانشورانہ نگاہ رکھتے تھے اسلئے دنیاوی و دینوی تعلیم کے بیچ کے خلاء کو پورا کرنا چاہتے تھے۔لہٰذا ہمیشہ تعلیمی نصاب کی بہتری اور ہمہ گیریت کو ابھارنے اور اُجاگر کرنے کی سعی کی۔خود فرماتے ہیں کہ:

"مذہبی تعلیم کے بغیر چارہ کار نہیں۔قومی تعلیم اگر اس چیز سے خالی رہے گی تو نہ تو سچی اخلاقی روح پیدا ہوسکے گی، نہ انسانیت کا سانچہ ٹھیک طرح ڈھالا جاسکے۔"

مولانا آذاد کے نزدیک تعلیم صرف روٹی روزی کمانے سے منسوب نہیں ہے بلکہ تعلیم سے شخصیت سازی کا کام بھی لیا جانا چاہئے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا مفید پہلو ہے۔مولانا آزاد اِس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اگر افراد کی شخصیت میں جذبہ ہم آہنگی اور یکجہتی نہ ہوگی تو سماج کی نااستواری ناگزیر ہے۔اُن کے نزدیک تعلیم درحقیقت انسان کی اندرونی اصلاح کا نام ہے اور تمدن ان کی نظر میں انسان کا خارجی پہلو ہے۔اس لئے وہ اس بات کے قائل تھے کہ پہلے نفس انسانی کی تربیت بہتر طریقے پہ کی جانی چاہئے۔ بحثیت وزیر تعلیم انکا یہ پختہ عزم رہا کہ تعلم و تعلیم کی ایسی پختہ بنیاد ڈالی جائے جس پر

آنے والی نسلیں ایک روشن مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہمیشہ چاہتے تھے کہ نوجوانوں میں روشن ذہنیت و اقدارِ سلیم پیدا ہونا چاہیئے۔ اُنکا ماننا تھا کہ صحیح طور آزادانہ اور انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم ہی لوگوں میں ایک صحیح اور سودمند تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔

مولانا آزاد نے ایک مکمل نظام حیات کے حصول میں مذہب اور تعلیم کے مشترکہ کردار کی اہمیت پر زور دیا۔ سائنسی و تیکنکی تعلیم کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد نے تہذیبی و ثقافتی ورثہ اور فنون لطیفہ کے فروغ کیلئے بھی کئی عملی اقدم اٹھائے۔ سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی کی ہمہ جہت ترقی و تشکیل کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے لیکن اس بات پہ ڈٹے رہے کہ جدید سائنسی تحقیقات کو عصری تقاضوں سے ہم اہنگ کیا جانا چاہئے۔ بقول آزاد:

"وزارت تعلیم سمبھالتے ہی میں نے جو فیصلہ لیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ و فنّی تعلیم کے حصول کیلئے سہولیتیں فراہم کی جائیں تا کہ ہم خود اپنی ضرورتیں پوری کریں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب ہندوستان میں باہر سے لوگ آکر سائنس اور فنی تعلیم میں تربیت حاصل کریں۔"

اینڈین کونسل فار اگریکلچرل اینڈ سایئنفک ریسرچ، انڈین کونسل فار سائنس ریسرچ، سنٹرل کونسل فار انڈسٹریل ریسرچ جیسے تعلیمی و تحقیقی اداروں کا قیام عمل میں لایا۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کو مولانا نازاد انسانی سیرت کی تعمیر و ترقی اور ذوقِ سلیم کو اجاگر کرنے کا ایک نہایت ہی پُر اثر اور کارامد ذریعہ گردانتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قومی نظام تعلیم میں ادب اور فنونِ لطیفہ کا ہونا ناگزیر ہے بچوں کی مکمل شخصیت سازی کیلیے مولانا آزاد نے مصوری، موسیقی، ڈرامے وغیرہ کو نہایت اہم قرار دیا ہے۔ یہ صرف بچوں کی اظہار ذات و جمالیت میں ہی معاون نہیں بلکہ یہ فنی، ثقافتی و تمدنی فروغ و ارتقا کا نہایت ہی موثر ذریعہ ہے۔ مولانا ازاد خود فرماتے ہیں:

"معیاری فن حقیقی تعلیم کا موثر ذریعہ ہے۔ وہ جزبات کو سنوارتا ہے اور ادراک و تخیل کی

تربیت کرتا ہے۔"

فن تعلیم کے جو مراکز قائم کئے ان میں سنگیت اکادمی، ساہتیہ اکادمی اور للت اکادمی معروف ومشہور ہیں۔ان اداروں کی تعمیر وتشکیل کے ذریعے مولانا ازاد چاہتے تھے کی ہندوستانی تہذیب وثقافت کو فروغ ملے اور انے والی نسلیں فیض حاصل کریں۔کئی سارے تعلیمی وسرکاری ادارے آزاد کے نام سے منسوب ہیں۔جن میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، مولانا آزاد نیشنل انسچٹوٹ آف ٹیکنالوجی بھوپال، مولانا آزاد میڈیکل کالج نئی دہلی اور مولانا آزاد انسچٹوٹ آف ڈینٹل سائنسز نئی دہلی قابل ذکر بھی ہیں اور قابل دید بھی۔مولانا آزاد کی تعلیمی سفارشات کی معنویت وافادیت موجودہ دور میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔انہوں نے جتنے بھی اقدامات اٹھائے، خیال یہی رہا کہ وہ عصری زمانہ کے تقاضوں کے موافق ہوں۔نصاب کی بات ہو یا تعلیمی تصورات یا ترجیہات کا معاملہ ہو، تخلیقی وثقافتی اداروں کے کھولنے یا پھر اساتذہ کی تربیت وترقی کا مشن، ہر جگہ انکا ہدف فرد وقوم کی ترقی رہا ہے۔مندرجہ ذیل چند سطور اسی خیال کی عکاس ہیں:

۱)۔چھ برس سے چودہ برس کے بچوں کیلئے تعلیم کو لازم کرنے کا فیصلہ مولانا ازاد نے جو لیا، اصل میں کسی بھی قوم کی ترقی وخوشحالی کی سچی بنیاد ہے۔قومی تعلیم کے فروغ کیلئے بنیادی سطح کی تعلیم نہایت ہی اہم اور ناگزیر ہے۔مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح کو بلند کرنے کیلئے بنیادی تعلیم پر توجہ مرکوز ہونی چاہئے اور یہ حقیقت آج بھی اپنی جگہ صحیح ہے اور آج بھی اس بات پر عمل جاری وساری ہیکہ بنیادی سطح کی تعلیم کو اجاگر کیا جائے تاکہ اعلیٰ تعلیم کیلئے صحیح طلباء میسر ہوں۔

۲)۔موجودہ دور میں ماہرین تعلیم وماہر نفسیات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہونا چاہئے۔مولانا آزاد نے 1949 میں ہی یہ سفارش کی تھی اور کہا تھا ’’اب وقت آگیا ہے کہ ملک میں ہر قسم کی تعلیم دیسی زبانوں میں ہی دیے جانے کا

تجربہ کیا جائے۔ یہ پسندیدہ امر ہے کہ ہر ہندوستانی دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط سیکھے۔"

۳)۔ عصری تعلیم کی افادیت واہمیت کا مولانا آزاد اعتراف بھی کرتے تھے اور ساتھ ساتھ انھوں نے مدارس کے نصاب کو عصری تقاضوں کے مطابق بنانے کی پرزور وکالت بھی کی تھی تاکہ درس وتدریس سے فارغ ہو کر طلباء شعبہ روزگار میں خود کو ثابت کریں۔

۴)۔ سائنسی تحقیقات اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کو وسعت واستحکام دینے کی خاطر جو نا قابل فراموش کام مولانا آزاد نے سر انجام دئے اسے ملک ہندوستان کی خوشحالی وترقی کافی مستحکم بنی۔

۵)۔ سائنسی وتیکنکی خوشحالی کے ساتھ ساتھ مولانا نے تہذیبی وثقافتی ترقی کو بھی قوم کیلئے لازم وملزوم ٹھہرا ایا۔

۶)۔ انھونے فنون لطیفہ اور اس کے تحفظ وترقی کیلئے نہایت ہی ٹھوس اقدم اٹھائے۔ ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للّت اکادمی جیسے ادارے مولانا آزاد کے تصورات کے عملی ترجمان ہیں۔

۷)۔ انہوں نے تعلیم نسواں، پیشورانہ تعلیم اور تعلیم صنعت وحرفت کو بھی قوم کیلئے بڑی اہمیت کا حامل قرار دیا۔

۸)۔ 1948ء میں یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا قیام عمل میں لانا تاکہ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے سہولیات بہم کی جائیں، مولانا آزاد کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے اور پھر 1956 میں یو۔جی۔سی قائم کر کے اعلی تعلیم کو انہوں نے زیادہ وسائل عطا کر کے اسے اور زیادہ فعال بنایا۔

۹)۔ تعلیم بالغان میں وسعت پیدا کرنے کی مولانا آزاد نے تلقین بھی کی اور ملک کی ترقی وخوشحالی کیلئے اسکو ایک اہم جز مانا۔ ان کا یقین قوی یہ رہا کہ جمہوریت کی مظبوط جڑیں تعلیم بالغان کے فروغ میں مضمر ہیں۔

10)۔ تعلیم اور سماج کے تئیں اساتذہ کے کام کو اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا ان کی ہر طرح کی تربیت و ترقی کے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔غور طلب بات یہ ہے کہ تربیت یافتہ اساتذہ ہی بچوں میں تحقیقی وتخلیقی قوتیں اجاگر کر سکتے ہیں۔

ماحصل: یہ بات مسلمہ ہیکہ مولانا آزاد نے ملک کیلئے جو نظریہ تعلیم پیش کیا ،اس کی معونیت وافادیت آج کے متغیر دور میں بھی محسوس کی جاتی ہے۔ان کی شفارشات چاہئے دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی بات ہو، سائنسی تحقیقات اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کا فروغ ہو، تہذیبی وثقافتی عروج ہو یا پھر اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا کام ہو، یہ سبھی چیزیں آج کی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے اہم نکات میں شامل ہیں۔غرض کہ آج ہندوستان تعلیمی میدان میں جن مقاصد کو حاصل کر رہا ہے انکے پیچھے مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر، سوچ، تدّبر اور دور اندیشی بنیاد بن کر شامل حال ہے۔۔ان کا علمی وادبی سرمایہ نئی نسلوں کیلئے باعث فخر بھی ہے اور مشعلِ راہ بھی۔ ملک وقوم کی بقاء کی خاطر ان کے تصورات اور پھر عملی میدان میں کئی سارے تعلیمی وثقافتی اداروں کا قیام عمل میں لانا اپنی جگہ پہ ایک مثال ہے۔قومی تعلیمی نظام، اعلیٰ وفنی تعلیم کے حصول کیلئے سہولتیں فراہم کرنا، سائنسی، تیکنیکی اور مادی ترقی کے ساتھ مذہبی اقدار کی پاسداری بھی اسی کوشش کی ایک اور کڑی ہے۔آغا شورش کشمیری کی شہرآفاق نظم آج بھی مناسب وموزوں ہے جو انہوں نے مولانا آزاد کی وفات پر کہی:

عجب قیامت کا حادثہ ہے — کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے — افق پہ مہر مبین نہیں ہے
تری جدائی سے مرنے والے — وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا — مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے

حوالہ جات:

ا۔ غبار خاطر، مولانا ابولکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1976

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی، طبع سوم، 1993

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد: فکروفن، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، 2007

۴۔ پیکر فکر و عمل: مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمد اختر، البلاغ پبلی کیشنز، نئ دہلی 2012

۵۔ خطبات آزاد۔ شورش کشمیری، مکتبہ شعروادب، لاہور پاکستان، 1944

۶۔ تزکرہ—مولانا ابوالکلام آزاد، ساہیتیہ اکادمی، نئ دہلی، 1980

۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد: کتابالتزکرہ، ہمائیوں کبیر، اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد، 1961

☆☆☆

Allama Shibli Nomani Bahaisiyat Moarrikh by Dr. Mufti Mohd. Sharfafe Alam (Associate Prof. dept. of Arabic MANUU, Hyderabad) 9705610569

ڈاکٹر مفتی محمد شرفِ عالم (اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ عربی، مانو، حیدرآباد)

علّامہ شبلی نعمانی بحیثیت مؤرخ

علامہ شبلی نعمانی ہندوستان کی مایہ ناز علمی وادبی شخصیات میں سے ایک ہیں، آپ کو اردو ادب میں ناقد، شارح، مورخ، سوانح نگار، سیرت نگار اور انشا پرداز کے اہم ارکان میں شمار کیا جاتا ہے، اپنے وقت کے مایہ ناز مفکر سمجھے جاتی ہیں، انیسویں صدی میں جن مفکرین نے ہندوستان میں اپنے اسلامی افکار کے ذریعہ انقلاب برپا کیا، عوام میں اسلام کی صحیح فکر کی جوت جگائی، اپنے نصب العین کی شناخت میں معاونت کی، مغربی فلسفیانہ نظریات کے شکنجہ میں پھنسنے سے عوام اور خواص کو چھٹکارہ دلانے میں اپنی کتابوں کو پیش کیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے ہندوستان کے زرخیز ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں 1857ء میں آنکھیں کھولیں، والدِ محترم شیخ حبیب اللہ پیشے سے وکیل تھے، لوگوں کے بھلائی کیکام آنے میں معروف تھے، تصوف کی طرف میلان تھا، بچوں کے نام معروف صوفیوں کے نام پر شبلی وجنید رکھا، انہیں دینی تعلیم دلوائی، چنانچہ شبلی کو قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں دلائی، پھر مولوی عبداللہ جیراج پوری سے اکتسابِ فیض کیا، اس کے بعد مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں مزید تعلیم کیلئے داخل کرائیگئے، جہاں مولانا فاروق چریا کوٹی سے استفادے کا موقعہ ملا، یہیں آپ نے اپنی دینی تعلیم مکمل کی، پھر مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کیلئے ان فنون کے مشاہیر علماء کی خدمت میں

زانوئے ادب تہ کیا، مثلاً فقہ مولانا ارشاد حسین رام پوری سے، ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے اور حدیث مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے حاصل کیا۔

شبلی کے والد علی گڑھ تحریک کے ابتدائی ہمنواؤں میں سے تھے، سرسید کے کالج کے مالی معاونین میں سے تھے، اور بعض عمارتوں کی تعمیر میں بھی آپ نے شرکت کی، نیز سرسید نے پٹریاٹک سوسائٹی کو قائم کیا تو آپ کو اعظم گڑھ کا کرس پانڈنگ رکن مقرر کیا، آپ نے اپنے بچوں، بھتیجوں اور اطراف واکناف کے بچوں کو تعلیم کیلئے علی گڑھ بھیجا 1882ء میں وکیل صاحب بچوں سیملنے علی گڑھ گئے تو شبلی بھی آپ کے ساتھ تھے، انہوں نے سرسید کی منقبت میں عربی میں قصیدہ پیش کیا، سرسید نے اس کو بہت پسند کیا اور سراہا۔ علّامہ شبلی نعمانی 1883ء میں علی گڑھ کالج میں فارسی کی جگہ پر اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے مشورے اور سفارش پر بحال ہوئے، علی گڑھ کا ماحول، اس کی لائبریری، سرسید کی مصاحبت اور پروفیسر آرنلڈ سے علمی مباحثات نے شبلی نعمانی کے افکارونظریات کی دنیا کو نئی روشنی دکھائی، علی گڑھ کالج قدیم وجدید علوم وفنون اور جدید دنیا کا ایک اہم مرکز تھا، اس کے قیام نے شبلی نعمانی کے فکرونظر میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ اسلام اور شعائر اسلام پر کئے جانے والے اعراضات سے آگاہی ہوئی، اس کے نتیجے میں اسلام کی صحیح سمت میں خدمت کے مواقع ملے۔ اس ضمن میں پہلا قدم کتب خانہ اسدنس ریہ ہے، اس مقالہ میں آپ نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اسکندریہ کے کتب خانہ کو عیسائیوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں نے بذات خود نذر آتش کیا اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیا۔ اس مقالہ نے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کیا اور مرابی قلم کاروں کو اپنے نظرئے میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کیا، دوسرا قدم الجزیہ اور تیسرا قدم حقوق الذمیین لکھ کر اٹھایا، یہ تمام مقالے مدلل اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر سپرد قلم کئے، الجزیہ کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرا کر سرسید نے شائع کرائے۔

اور چوتھا قدم مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے، اس میں آپ نے مسلمانوں کے علمی تمدن

وثقافت اور علوم وفنون میں ان کی خدمات کا مبسوط تذکرہ کیا، اور پانچویں قدم کے طور پر 1887ء میں خلیفہ مامون کی سوانح حیات پر المامون سپرد قلم کیا، جو مقبولیت کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، اور جلد ہی دوسرے ایڈیشن کی مانگ آنیلگی جو 1889ء میں سرسید کے دیباچہ کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہوئی، اور اس سلسلے کی چھٹی کڑی سیرۃ النعمان ہے،آپ کی تصنیفات جہاں ایک طرف سرسید کے زیراثر نئے پیدا ہونے والے نظریات وافکار کی غمازی کررہے ہیں تو دوسری طرف مطالعہ کی گہرائی اور روایتی مذہبی تحقیقات کے گہرے مشاہدات کا پتہ دیتی ہیں۔

شبلی نعمانی ساتویں قدم کے طور پر اپنی تصنیف الفاروق منصۂ شہود پر لائے، اس میں تحقیق وتاریخ نگاری کی اعلی روایت کوملحوظ رکھا،اس نے علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔علامہ شبلی نے 1894ء میں ممالک اسلامیہ کی علمی سیاحت کی، جن میں مصروشام،لبنان وفلسطین،روم اور ترکی وغیرہ شامل ہیں۔اس سفر کے کئی اغراض تھے، جن میں الفاروق کے لئے واافر مقدار میں مواد کا حصول، کیوں کہ شبلی کی نظر میں ہندوستان کے کتب خانے الفاروق لکھنے کیلئے ناکافی تھے، اور اسلامی تاریخ کی آثار قدیمہ کا مطالعہ ومشاہدہ نیز اسلامی ممالک کے طریقہ تعلیم اور تعلیم کے نصاب کا مطالعہ۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے کتب خانوں سے استفادہ کیا،نوٹ لئے،نقل نویسوں سے کتابیں نقل کرائیں،قسطنطنیہ کے اکثر کتب خانوں سے اپنی علمی پیاس حتی المقدور بجھائی، اور دوسری طرف متعدد نامور شخصیات سے ملنے کے مواقع دستیاب ہوئے،جن میں جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ،عثمان پاشا سرفہرست ہیں، ان چوٹی کے مفکرین کے افکاروخیالات سنے اور سمجھا،اسلامی مبادیات میں تفکر وتدبر کیا،اور خلیفہ عبدالحمید کی ملاقات سے بھی بہرور ہوئے،خلیفہ نے علامہ شبلی نعمانی کو تمغہ مجیدیہ عنایت فرمایا۔اوراس طرح آپ کا سفر کامرانی سے طے ہوا۔

علامہ شبلی نعمانی کو علی گڑھ کی آب وہوا موافق نہ آئی، ان کی صحت متاثر رہنے

لگی ،انہوں نے سرسید کے سامنے یہ پروپوزل رکھا کہ انہیں چھ ماہ کی رخصت دی جائے تا کہ وہ چھ ماہ علی گڑھ میں رہ کر کالج میں تدریسی خدمت انجام دیں،اور دوسرے چھ ماہ کہیں اور قیام کر کے تصنیف وتالیف میں گزاریں،سرسید نے اس کی منظوری دیدی،لیکن ۲۷ مارچ 1898ء کوسرسید کا بلاوا آ گیا، وہ عازم سفرآخرت ہو گئے،علامہ کواس کا جانکاہ صدمہ پہونچا،اورعلی گڑھ کی ملازمت سے اسی سال مستعفی ہوگئے۔

علامہ شبلی اعظم گڑھ آ گئے،اوران کے والدشیخ حبیب اللہ بیمار ہوکر 12 اگست 1900ء کوداغ مفارقت دے گئے،ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کیلئے حیدرآباد کی طرف عازم سفر ہوئے، اور 1901ء میں ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدراباد کے عہدہ پر فائز ہوئے۔اس دوران الکلام،علم الکلام،سوانح مولانا روم اورالغزالی جیسی تحقیقی کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔لیکن حیدرآباد کی اندرونی سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے دل برداشتہ ہوگئے، اور اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے اور وظیفہ کے اجرا کی درخواست دیدی جومنظور ہوگئی تو آپ نے حیدرآباد کوخیر باد کہہ دیا، اورلکھنوآ کر ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوگئے۔

علامہ شبلی ندوہ کی تحریک کے ابتدائی فعال لوگوں میں سے ایک تھے،اس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے ،قراردادیں پیش کرتے،تعلیم،طرزتعلیم اور نصاب تعلیم پر بحث ومباحثہ کرتے،آپ کوقدیم علوم سے گہری مناسبت تھی،آپ نے ندوہ کا دستور بنایا، اس کے اغراض ومقاصد طےکیئے،اس کا نصاب تعلیم آپ نے تیارکیا،آپ کو 1904ء میں ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم منتخب کیا گیا،آپ نے اپنی تمام صلاحیتیں اس کے فروغ پرصرف کردیں۔آپ نے نوسال تک ندوہ کی خدمت کی، وہاں الندوہ ماہنامہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے،اورطلبائے ندوہ کی تربیت اورتحریری صلاحیت اسی پرچے کی مدد سے انجام دیئے،جن میں مولانا سیدسلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی،عبداللہ عمادی وغیرہ اسی رسالے کے ذریعہ آسمان علم وادب پر اہل قلم کی حیثیت سے چمکے،مولانا

ابوالکلام آزاد نے بھی چند ماہ الندوہ کے نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور علامہ شبلی کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔اسی دوران موازنہ انیس و دبیر پھر شعرالعجم کی چار جلدیں تحریر کیں، اور اسی دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے کا عزم مصمم کیا، اور اس کام کا آغاز کردیا، اور سیرۃ النبی کے نام ایک ایسی کتاب دنیا کو تحفہ کے طور پر دیا، جس کا محققانہ طرز، زبان و بیان کی ندرت، بنیادی مآخذ کا برمحل استعمال، یہ وہ خصوصیات ہیں جس نے اس کتاب کو لازوال شہرت عطا کی اور اردو زبان میں سیرت کے موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں میں امہات کتب کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی 1913ء میں ندوۃ العلماء سے مستعفی ہو گئے، اور اعظم گڑھ آ گئے، یہاں شہر کے بیچ میں اپنے باغ اور بنگلے کی زمین پر دارالمصنفین کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد کا خاکہ پیش کیا، جس میں علماء اور اسکالرز کی ایک جماعت اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے لیکر ہندوستانی تاریخ کے مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلے مہمان خانہ تعمیر کرایا، پھر طلبہ کو بلایا، اور اس کے لئے مالی انتظامات کی فکر میں تھے کہ دارفانی سے بلاوا آ گیا۔اور سیرۃ النبی کہتے ہوئے 18 نومبر 1914ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔علامہ شبلی نعمانی نے علوم اسلامی وار دوادب کی کتب میں سیرۃ النبی ،سیرۃ النعمان، الفاروق، المامون، الغزالی، امام ابن تیمیہ،سوانح مولانا روم،اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر،الکلام،علم الکلام،سفر نامہ روم،مصروشام،مقالات شبلی، شعرالعجم،موازنہ انیس و دبیر وغیرہ شامل ہیں۔

جب ہم علامہ شبلی نعمانی کا مطالعہ بحیثیت مؤرخ کے کرتے ہیں تو وہ ہمیں ہندوستان کے انیسویں صدی میں ایک تابناک نام کی حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ جو تاریخ کے شناور، فکر کی بلندی، ادب وتنقید میں مہارت، علم کی برتری، تہذیب سے اگاہی، اقوام ومذاہب کیہاب میں گہرے غواص کی حیثیت سے اب تک کی تاریخ میں امتیازی شان رکھتی ہیں۔انہوں نے اردو کتب خانے کو اپنے قیمتی تصنیفات سے مزین کیا، اپ اپنی

خدمات کی وجہ سے ایک عہد کے مشابہ سمجھے جاتیہیں، ان کو ماہر اساتذہ، رفقائے کار مخلص اور ماحول ساز گار ملا، جس نے ان کے علمی وفکری ذوق کی ابیاری کی، اور جوانی کی عمرسیہی ان کی تصنیفی صلاحیت اور فکر کی گہرائی کے نوعنے لوگوں کے سامنے انے لگے۔ علامہ شبلی نے علم وادب اور فکر وفلسفہ کے بیشتر موضوعات میں اپنے قلم کے جادو کا لوہا منوایا، لیکن تاریخ نگاری اوراس میں تحقیق وتدقیق کی اساس رکھی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور علمی جغرافیہ عریض تھا، انہوں نے اپنے نظر کی گہرائی سے تاریخ لکھنے کے ایسے اصول مقرر کئیجو ان کے زمانہ میں اردو زبان میں نہیں تھے۔ انہوں نے معلومات کے چھان پھٹک میں جدید ضابطوں کو استعمال کیا، اور کھڑے کھوٹے میں تمیز کی جس کے پیش نظر ان کی تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے ساتھ استدلال کی قوت، ہنر کی گیرائی کو کام میں لاکر تاریخ اسلام کی خصوصیات پر قلم کے مہمیز کو تیز کیا، اور دوسری طرف مستشرقین کے اتہامات کا بھرپور انداز میں جواب دیا، اسلام کی علمی مصادر، پسِ منظر وپیش منظر کی ایسی عکاسی کی کہ معاصر دنیا محوِ حیرت رہ گئی۔

علامہ شبلی نے عملی زندگی کے ابتدا ہی میں اسلام کی تاریخ اور سیاست وتہذیب کے سرمایہ کی قلت کو محسوس کیا، اور انہوں نے اس کمی کے تدارک کے طور پر اسلامی تاریخ کے تسلسل کو علمی اعتبار سے دنیا کیسا منیلانیکا فیصلہ کیا، اور جن شخصیات نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر کسی طرح بھی اثر ڈالا ان کی سوانح لکھنے کا عزم مصمم کیا۔ چونکہ ان کیکام کا جذبہ تابناک اور حوصلہ قوی تھا، انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل درامد شروع کردیا، اور 1888ء میں المامون، 1890 میں سیرۃ النعمان، 1899 میں الفاروق، 1901 میں الغزالی، 1906 میں سوانح مولانا روم، 1912ء کے ابتداء میں سیرۃ النبی جیسی عظیم شاہکار پیش کیں، اور ان کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیر، مکتبہ اسکندریہ، ذمیوں کے حقوق، جزیہ، عہدِ اسلامی تعلیمی نظام اور دیگر بیسیوں تاریخی موضوعات اور تحقیقی مقالات اور رسائل پیش کیئے۔

اکابر اہلِ تنقید وبصیرت نے علامہ شبلی کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے منفرد طرز ایجاد کے تفوق کو تسلیم کیا ہے، ان میں ال احمد سرور، شیخ محمد اکرام اور مہدی افادی وغیرہ شامل ہیں۔شبلی کا زور، لفظوں کی تراش خراش، اسلوبِ بیان کو خوب سے خوب تر بنانے پر بھی ہوتا تھا، چنانچہ سر سید احمد خاں المامون کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک اتا ہوگا۔ سید صباح الدین عبدالرحمان اس کتاب کے تبصرے میں رقم طراز ہیں، مولانا کی جوانی کی رعنائیاں اس کتاب میں گل وصنوبر بن کر دکھائی دیتی ہیں، اگے چل کر انہوں نے اور بھی کتابیں لکھیں، لیکن اس کتاب میں قدم قدم پر جو خصوصیات دکھائی دیتی ہیں، وہ شعر العجم کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں، اس کے لکھنے میں قلم کی سرشاریاں خود رہنما بنی ہیں، المامون میں تاریخ کے خشک واقعات سمیٹے جارہے تھے، اس کو مولانا نے اپنے ادب وانشا کے حسن کا صحیفہ بنادیا ہے۔

علامہ شبلی نے جس ماحول میں انکھیں کھولیں، اس ماحول میں اسلامی تاریخ پر مختلف اعتراضات کے بوچھار کئے جارہےتھے، یہ اس وقت کا بہت بڑا چیلنج تھا، علامہ شبلی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور تاریخ اسلام کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا، اور اس میں معتد بہ مقام حاصل کیا، نیز تاریخی واقعات میں روایت ودرایت دونوں کا لحاظ رکھا، اور تاریخی مواد کی فراہمی میں تراجم، طبقات، سفرنامہ، جغرافیہ وغیرہ سے موثوق بہ معلومات اخذ کیااور ہمیشہ معتبر، قابلِ اعتماد اور صحیح ترین روایتوں پر اعتماد کیا، اپ اس راہ میں پہلے شہسوار ہیں، جنہوں نے تاریخ کے مفہوم میں توسع سے کام لیا، اور اپنی بالغ نظری سے ان خانوں کو بھر دیا، جن کو عرب اور اسلامی مؤرخین خالی چھوڑ گئے تھے، تاریخ نویسی کیلئے غیر جانبداری رگِ جاں کی حیثیت رکھتی ہے، علامہ میں یہ چیز کامل درجہ میں پائی جاتی تھی، چنانچہ علامہ نے اسلامی اور ایرانی مؤرخین کے تاریخ کے اصول، افکار وخیالات کیساتھ مغربی مؤرخین کے عمدہ اصولوں سے بھی خوشہ چینی کی ہے، جس کا اعتراف تاریخ کے

ماہرین نے بھی کیا ہے۔

علامہ شبلی کی تاریخی وسوانحی تصنیفات کے مطالعے سے ان کی تاریخ نویسی کے کچھ بنیادی اصول سامنے آتی ہیں، جن کا ذکر کہیں تو خود انہوں نیاپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے،اور بعض ان کی نگارشات کے مطالعے سے اخذ کی جا سکتی ہیں، ان اصول کی نشاندہی ڈاکٹر محمد سہیل شفیق،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی نے معارف شبلی کے نام سے جمع کر کے شائع کیا ہے،ان کی تلخیص کچھ اس طرح ہے:

۱۔تاریخ صرف سیاسی امور پر مشتمل نہ ہو، بلکہ ادبی تہذیب وتمدن کی سرگزشت بھی ہو، جس میں اجتماعات انسانی کی معاشرت، اخلاق،عادات،مذہب، ہر چیز سے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲۔روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینا بھی ضروری ہے،اپنے تمام اصولِ تاریخ نویسی میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے۔

۳۔سبب تلاش کیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

۴۔فلسفہ، انشا پردازی اور تاریخ کی سرحدیں الگ الگ ہیں،ان میں وہی فرق ہے جو ایک خاکے، نقشے اور تصویر میں ہوتا ہے۔مؤرخ کا فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری سے تجاوز نہ کرے،البتہ شبلی کی خصوصیت یہ ہے کہ سادہ واقعہ نگاری میں بھی پرکاری اور بیان واسلوب کے حسن کو مکمل طور پر ملحوظ رکھتے ہیں،اس لئے تاریخ نگار اگر ایک طرف شبلی ہے،اور دوسری طرف کوئی اور تو قاری غیر محسوس طریقے پر شبلی کی تحریر کی طرف کھنچتا چلا جائیگا۔

۵۔شبلی تاریخ کو ملی تناظر میں دیکھتے ہیں،ان کی تحریر ہیکہ ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ وتیموریہ حکومت کے کارنامے بڑی آب وتاب سے دکھائے گئے،لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ بھی ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔

۶۔علامہ شبلی کا خاص مشن اور مقصد اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ کے کذب وافتراء اوران کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ تھا، جرجی زیدن کی تاریخ تمدن اسلامی کی مدلل تردید اور دیگر کتب، سیر وتاریخ میں مستشرقین کے اتہامات کا تعاقب ان کے تحریر کا خاص امتیاز ہے۔
۷۔شبلی چھوٹے چھوٹے تاریخی جزیئے کو دلیل اور حوالے سے مبرا نہیں کرتی ہیں، اس کے ساتھ وہ جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں، ان کے پائیہ اعتبار و استناد کو بھی بیان کرتے جاتے ہیں، حتی کہ ان کے مصنف کے علمی، اخلاقی احوال پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔
۸۔مغربی مصنفین کی غلط بیانی کی وجہ تعصب کیعلاوہ یہ بھی تھی کہ وہ پرانے زمانے کا مقابلہ جدید دور سے کرتی ہیں، ایک مورخ کے دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ماضی کو ماضی کی نظر سے دیکھا جائے۔
۹۔بہت سے مغربی مورخین نبینو امیہ یا بنوعباسیہ کے بعض خلفاء کے ذاتی اعمال وافعال کو اسلام سے منسوب کر کے مذہبِ اسلام کو موردِ الزام ٹھہرانے کی مذموم حرکت کی ہے، حالانکہ یہ قطعا نامناسب حرکت ہے۔
۱۰۔علامہ شبلی کے نزدیک یورپ کے تاریخی ذخائر میں بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی پرواہ نہیں کی جاتی، اگر کوئی واقعہ پیش اجائے تو ہر قسم کی بازاری افواہیں بھی قلم بند کر لی جاتی ہیں، ان راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا۔
۱۱۔شبلی اسلامی علوم پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اسلامی تاریخ وتہذیب پر ان کی نظر گہری تھی، نئے حالات ورجانات، تازہ خیالات وافکاراور جدید مسائل وتحقیقات کے وہ غواص تھے، اس لئے مستشرقین کے اعتراضات کی تہ تک پہونچنے اور ان کے مدلل جواب دینے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔
۲۱۔علامہ شبلی نے مواد کی تحقیق وترتیب اور تنقید کی شرط اور فنی طور پر اردو میں برتا، اسی لئے علامہ شبلی کی تمام تصنیفوں میں متضادروایاتکے مابین صحیح کو غلط سے ممتاز کیا جاتا ہے۔

۱۳۱۔مواد کے حصول کیلئے سیکڑوں ماخذ کے ہزاروں صفحات کھنگالے اور زیر قلم تالیف کیلئے تمام ممکنہ مراجع کا پتہ لگایا، ان کو مختلف کتب خانوں میں تلاش کیا، ان کا مطالعہ کیا، ضروری معلومات اخذ کین، اور ہر طرح سے ان کو حاصل کیا، وہ نہ صرف متحدہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے اسفار کئے، بلکہ جہاں سے بھی کام کی چیزیں دستیاب ہوسکیں، ہر جتن کر کے اس کو حاصل کیا۔

علامہ شبلی نے اسلامی حکومتوں کا ایک مفصل تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن بعض وجوہ سے وہ ترتیب کا لحاظ نہ رکھ سکے، جو ان کے ذہن میں تھا، اور مختلف اسلامی خلفا اور حکمرانوں میں جو ان کے نزدیک عظیم الشان تھے، ان سب کی سوانح مرتب انداز میں نہ لکھ سکے۔ اگر زمانے نے مساعدت اور عمر نے وفا کی تو اس سلسلے کے کل حصے جس طرح ہو سکے گا پورا کرنیکا عزمِ مصمم کیا۔ المامون کو دو حصوں میں تقسیم کیا، پہلے حصے میں مامون کی زندگی کے تمام تر سانحات کو نہایت احتیاط سے بیان کیا، اس سلسلے میں عرب مورخین کی کتابوں کے ساتھ مغربی مصنفین میں گبن، کارلائل، بکل اور ہیگل وغیرہ کی تصنیف کو بھی باریک بینی سے پڑھا ہے، ہر تالیف میں ان کا یہ طریقہ رہا ہے، جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں مستند معلومات اور جدید طرزِ نگارش کے بہترین نمونوں کے ساتھ مغربی مؤرخین کے سہو و تعصّبات پر معقول گرفت بھی پائی جاتی ہے۔

اس حصے میں اسلامی خلافت پر اجمالی روشنی ڈالنے کے بعد بنوامیہ اور بنوہاشم کی باہمی چپقلش اور بنوعباس کی سلطنت کی ابتدا کو بیان کیا ہے، اس کے بعد مامون کی پیدائش، تعلیم و تربیت، اس ضمن میں اس کی بیمثال ذہانت، اور حاضر دماغی کے مختلف واقعات، ہارون رشید کا مامون پر حد درجہ اعتماد، مامون کی ولیعہدی، مامون و امین کی طرف سے لکھے جانے والی دستاویزات، مامون و امین کے درمیان میں برپا ہونیوالے سیاسی نزاعات، معرکے، مامون کی افواج کے ذریعے بغداد کا محاصرہ، امین کا قتل اور مامون کا تخت خلافت پر متمکن ہونا، مامون کے دور میں رونما ہونیوالی مختلف بغاوتوں کا ذکر اور

مامون کا ان سے کامیابی کے ساتھ سرکوبی کرنا، اور فتوحات اور اس کی وفات کا احوال بیان کیا ہے۔دوسرے حصے میں مامون کے عہد کے سیاسی انتظامات،سماجی حالات، مامون کی ذاتی وسیاسی زندگی کے نشیب وفراز،خصائص وعادات،علمی حیثیت،علمِ حدیث،تفسیر،فقہ،ایام العرب،ادب،انساب،فلسفہ،شعروشاعری،ریاضی،فنونِ لطیفہ وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،مامون،مصنف کا ہیرو ہے،اس کی زندگی کے ہر واقعہ وہر پہلو کو وضاحت سے بیان کیا ہے،کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہیرو کی خامی کو بھی زورِ بیان سے خوبی بنا کر پیش کررہے ہیں۔

مامون نہایت ذکی الحس ، بیدار مغز ،دوراندیش حکمراں تھا، اپنے گورنروں کو مختلف موقعوں پر جو فرامین لکھوا کر بھیجا، وہ وقتی احکام ہونے کے علاوہ حکمت وتدبر کے عمدہ نمونے ہوا کرتے تھے،بغاوتوں اور ان کے اسباب وعلل سے بھی بحث کی ہے،مامون کے علمی ذوق،فلسفہ وحکمت کی ترویج میں اس کے انہماک کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔شبلی ایک غیر جانبدار مؤرخ ہیں،اس لئے انہوں نے مامون کی خوبیوں کے دوش بدوش اس کی شاہانہ خامیوں، بیجا شان وشوکت اور عیش وطرب کی مجالس کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، ایک طرف مامون اپنی نجی زندگی میں اخلاق کا پیکر نظر آتا ہے تو دوسری طرف اس کے یہاں شاہانہ طمطراق اور اس کے چونچلے بھی ملتے ہیں،مثال کے طور پر ایک شادی میں پانچ کروڑ درہم خرچ ہوئے، مسلسل انیس دنوں تک بارات کی خاطر داری ہوتی رہی، مہمانوں پر مشک وعنبر میں بسائی ہوئی گولیاں نچھاور کی گئیں، جو کاغذ کے ٹکڑوں میں لپیٹی ہوئی تھیں،اور ان پر غلام، باندی، نقد املاک،خلعت،اسپ خاصہ اور جاگیر وغیرہ کی خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، اور یہ عام حکم تھا کہ جس کی گولی پر جو لکھا ہو،اسے اسی وقت دلا دیا جائے، مامون کے لئے ایک نہایت پر تکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنا ہوا تھا،اور گوہر ویاقوت سے مرصع تھا،مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا،تو بیش قیمت موتی نچھاور کئے گئے، جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے۔

الفاروق کوبھی دوحصوں میں منقسم کیاہے، پہلے حصے میں تمہید کے ذیل میں تاریخ کی تعریف اورقدما کی تاریخیں، متاخرین کادور، روایت ودرایت کافرق، یورپ کی بیاعتدالی سیاحتراز، نام ونسب، سن رشد وتربیت، قبولِ اسلام، وفاتِ رسول ؟، سقیفہ بنوساعدہ، حضرت ابوبکر کی خلافت، اور حضرت عمر کا استخلاف، خلافت وفتوحات، عراق وشام پر اسلامی حملہ کے اسباب، فتوحاتِ عراق، فتوحاتِ شام، شام کی لشکرکشی کے ابتدائی حالات، فتح دمشق، بیت المقدس وغیرہ اوراخیر میں حضرت عمر کی شہادت وغیرہ۔ اخری ٹکڑہ حضرت عمر کی شہادت ہے جو 26 ذی الحجہ 23 ہجری مطابق 644ء کوواقع ہوا، اپ کے خلافت کی مدت دس برس چھ مہینہ چاردن ہے، اس موقعہ پر صحابہ بار بار حضرت عمر سے درخواست کرتیتھیکہ اس اس اہم فریضہ کواپ طے کرجائیں، حضرت عمر نے خلافت کے معاملے پر مدتوں غور کیاتھا اوراکثر اس سوچ میں غلطاں رہتے تھے، لوگ دریافتِ حال کرتے توفرماتے کہ خلافت کے بارے میں سوچ رہاہوں۔ مدت غوروفکر کے بعدبھی کسی پرنظرانتخاب نہیں جمتی تھی، بارہاان کے منہ سے بیساختہ اہ نکل جاتی تیے، کہ افسوس اس بارِگراں کاکوئی اٹھانے والانظرنہیں اتا، تمام صحابہ میں اس وقت چھ اشخاص تھے، جن پرانتخاب کی نگاہ پڑتی تھی، وہ حضرات علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن قاص، عبدالرحمن بن عوف ہیں۔ غرض وفات کے وقت جب لوگوں نے اصرار کیاتوفرمایاکہ ان چھ شخصوں میں جس کی نسبت کثرت رائے ہو، وہ خلیفہ منتخب کرلیاجائے۔ تین دن کے بعدمحرم کی پہلی تاریخ ہفتہ کے دن افتابِ عالم تاب خاک میں روپوش ہوگیا، جنازہ صہیب رومی نے پڑھائی، اور حضرت عبدالرحمن، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن قاص اورحضرت عبدالرحمان بن عوف نےقبرمیں اتارنے کافریضہ انجام دیا۔

دوسرے حصے میں فتوحات پر ایک اجمالی نظر، نظامِ حکومت، ملک کی تقسیم، صوبجات واضلاع، عہدہ دارانِ ملکی، صیغہ محاصل وخراج، اورقسم کی امدنیاں، صیغہ عدالت، افتا، فوج داری وپولس، بیت المال یا خزانہ، پبلک ورکس، شہروں کی ابادکاری، صیغہ فوج، صیغہ

تعلیم ،متفرق انتظامات، ذمی رعایا کیحقوق ،غلامی کا رواج کم کرنا، سیاست وتدبیر ،عدل وانصاف، امامت واجتہاد، ذاتی حالات واخلاق ،ازواج واولاد اور خاتمہ، خاص طور سے ان کے مجتہدانہ کارناموں کونہایت تفصیل سے سپرد قلم کیا ہے۔ہم ان کارناموں میں سے ایک کونمونہ کے طور پر پیش کریں گے، تاکہ اس مرد جانباز کیکارناموں پر کچھ روشنی ڈالنے میں ہمارا بھی حصہ ہوجائے۔ اس سلسلے میں پہلی مثال علامہ نے فتوحات فاروقی کے تحت یورپین مؤرخین کے بیان کوتردیدی انداز میں بیان کیا ہے، ہم سب سے پہلے اس کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتیہیں، اس سے ایک طرف تو یورپین مؤرخین کا جواب ہوگا اور دوسری طرف علامہ کی بصیرت افروز تاریخی پہلو بھی اجاگر ہوگا۔اس کے لئے ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

یورپین مؤرخین کا یہ کہنا ہے کہ عہدِ فاروقی میں فارس وروم کی دونوں سلطنتیں اوجِ اقبال سے گر چکی تھیں، کیوں کہ خسرو پرویز کے بعد فارس میں نظامِ سلطنت بگڑ چکا تھا، حکومت کوسنبھالنے والا کوئی لائق شخص موجود نہیں تھا، دربار کے عمائدین میں سازشیں شروع ہوچکی تھیں، حکومت میں عدمِ استحکام پیدا ہوگیا تھا، اس کے نتیجے میں تختِ سلطنت پر متمکن ہونے والے ادلتے بدلتے رہتے تھے، ایک اور وجہ نوشیرواں سے کچھ پہلے مزدکیہ فرقہ کا بہت زور تھا، جوالحاد وزندقہ کی طرف مائل تھا، نوشیرواں نے تلوار کے زور پر اس کو دبا دیا تھا، لیکن مٹانے میں کامیابی نہ مل سکی تھی، اسلام کا نور جب فارس میں پہونچا تو اس فرقہ والوں نے مسلمانوں کو اپنا پشت پناہ تصور کیا کہ وہ کسی کے عقائد ومذہب سے تعرض نہیں کرتے تھے، عیسائیوں میں نسطورین فرقہ جس کوکوئی حکومت پناہ نہیں دیتی تھی، وہ بھی اسلام کے سایہ عاطفت میں پناہ لیکر اپنے مخالفوں کے استبداد سے محفوظ ہوچکا تھا، اس طرح دو بڑے فرقوں کی ہمدردی مسلمانوں کو حاصل ہوگئی۔

روم کی سلطنت کمزور ہوچکی تھی، نیز عیسائیوں کی باہمی چپقلش زوروں پر تھی، اس وقت مذہب حکومت کے انتظام میں دخیل تھی، اس کا اثر مذہبی خیالات تک محدود نہ تھا، اس کی

وجہ سے حکومت اضمحلال کا شکار ہوئی جاتی تھی۔

علامہ شبلی نعمانی نے یورپین مؤرخین کے طرز استدلال کی قلعی کھولی اور یہ بیان کیا کہ اس وقت فارس وروم کی سلطنتیں عروج کمال پر نہیں تھیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عرب جیسی بیسر وسامان قوم سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتیں، کیوں کہ فارس وروم فنونِ جنگ میں مانے ہوئے کھلاڑی تھے، رسد کی فراوانی، ساز وسامان کی بہتات، جنگی الات کے تنوع، فوجوں کی کثرت، حفاظتی قلعوں کی سہولت حاصل تھی، البتہ تخت نشینوں کے ادل بدل سے نظام میں اضمحلال اگیا تھا، لیکن خزانہ، فوج اور محاصل کا نظام پہلے ہی جیسا تھا، چنانچہ جب یزدگرد تخت نشیں ہوا، اور درباریوں نے اصلاح کی طرف توجہ کی تو نئے سرے سے وہی ٹھاٹھ باٹھ قائم ہوگئے۔

علامہ شبلی مزوکی فرقے کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ وہ ایران میں موجود تھا، لیکن پوری تاریخ میں ان سے کسی قسم کے معاونت کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے، اسی طرح فرقہ نستورین کی طرف سے کسی بھی قسم کے اعانت سے تاریخ کے اوراق خاموش ہیں، نیز عیسائیت کے اختلافِ مذہب کا اثر بھی کسی واقعہ میں خود یورپین مؤرخین نے کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ آخر میں عربوں کی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی فوجیں جو مصر، ایران اور روم میں برسر پیکار تھیں، ان کے فوج کی تعداد کبھی ایک لاکھ تک نہ پہونچ سکی، فنونِ حرب سے واقفیت کا حال یہ تھا کہ یرموک پہلا معرکہ ہے، عرب نے تعبیہ کے طرز پر صف ارائی کی، خود، زرہ، چلنہ، جوشن، بکتر، چارائینہ، اہنی دستانے، جھلم، جو ہر ایرانی سپاہی کا لازمی ملبوس جنگ تھا، ان میں عربوں کے پاس صرف زرہ تھی، اور وہ بھی اکثر چمڑے کی ہوتی تھی، رکاب لوہے کے بہ جائے لکڑی کی تھی، الاتِ جنگ میں سے گرز وکمند سے عرب بالکل واقفیت نہ رکھتے تھے، تیر تھے لیکن ایسے چھوٹے اور کم حیثیت کے کہ قادسیہ کے معرکہ میں ایرانیوں نے جب پہلے پہل ان کو دیکھا تو سمجھا کہ یہ تکلے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے فتوحات کے اصلی اسباب اس طرح بیان کیا ہے کہ مسلمانوں

میں اس وقت بانیء اسلام کی بدولت جو جوش وعزم ، استقلال، بلند حوصلگی ، اور جرت پیدا ہوگئی تھی اور اس کو حضرت عمر نے اور زیادہ تیز کردیا، روم وفارس کی حکومتیں اپنے عروج کے زمانے میں بھی اس سے ٹکر نہیں لے سکتی تھیں، اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں، جنھوں نے قیامِ سلطنت میں معاونت کی، اس میں سب سے مقدم مسلمانوں کی راست بازی، اور دیانت داری تھی، جو ملک فتح ہوجاتا تھا، وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راست بازی کے اس قدر گرویدہ ہو جاتیتھیکہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے، یرموک کے معرکے میں مسلمان جب شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا نپکار کر کہا کہ خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے اور یہودیوں نیتوریت ہاتھ میں لیکر کہا کہ ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آسکتا۔

شام ومصر میں جو حکومت رومیوں کی تھی، ان کا انداز جابرانہ تھا، رومیوں کا مقابلہ مسلمانوں سے سلطنت اور فوجی زور کی بنیاد پر تھا، مسلمانوں نے جب ان کا زور توڑ دیا تو رعایا کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی، البتہ ایران کی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں سلطنت کے نیچے بہت سے بڑے بڑے رئیس تھے، جو بڑے بڑے اضلاع اور صوبوں کے مالک تھے، وہ سلطنت کیلئے نہیں، بلکہ خود اپنی ذاتی حکومت کی حفاظت کیلئے معرکہ ارائی کرتیتھے، چنانچہ کسری کا پایہ تخت فتح کر لینے کے بعد بھی فارس میں قدم قدم پر مسلمانوں کو مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن عام رعایا وہاں بھی مسلمانوں کی گرویدہ تھی، اور ظفر یابی کے بعد حکومت کے قیام واستحکام میں ان سے بہت معاونت ملتی تھی۔

علامہ ایک اور بڑے سبب کی نشاندہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ مسلمانوں کا پہلے پہل حملہ شام وعراق پر ہوا، ان دونوں مقامات میں کثرت سے عرب سکونت پذیر تھے، شام میں دمشق کا حاکم غسانی خاندان تھا، جو برائے نام قیصر کا محکوم تھا، عراق میں لخمی خاندان والے ملک کے مالک تھے، گرچہ کسری کو خراج کے طور پر کچھ دیتے تھے، ان عربوں نے اگرچہ عیسائی ہونے کی وجہ سے اول اول مسلمانوں کا مقابلہ کیا، لیکن قومی

اتحاد کا جذبہ رائیگاں نہیں گیا،عراق کے بڑے بڑے رئیس بہت جلد مسلمان ہو گئے،اور مسلمان ہوجانیپر وہ مسلمانوں کے دست وبازو بن گئے،شام میں بھی اخرعربوں نے اسلام قبول کرلیا اور رومیوں کی حکومت سے ازادی حاصل کرلی۔الغزالی کوبھی دوحصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں امام غزالی کی پیدائش، تعلیم ،تعلقات کا ترک اورعزلت وسیاحت،اوروفات۔

دوسرے حصے میں تصنیفات، اورتصنیفات پر مختلف حیثیوں سے بحث، تصنیفات کی قبولیت،امام صاحب کی تصنیفات اور یورپ،علوم وفنون،احیاءالعلوم کا زمانہ تصنیف وخصوصیات،علم کلام،فلسفہ کا ابطال،فلسفہ کا رد تہاف الفلاسف، اثباتِ عقائد،تصوف،مجددیت، تعلیم کی اصلاح،اخلاق کی اصلاح،علماء کے اخلاق کی خرابی وغیرہ سے دوسرحصہ اختتام کو پہونچا۔اس کتاب سے بھی ایک یا دومثال پر اکتفا کروں گا جس سے علامہ کی محنت کا اندازہ ہوگا اوران کے مؤرخانہ شان کی طرف اشارہ بھی ہوگا، پہلی مثال احیاءالعلوم ہے۔

احیاءالعلوم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے،ہرفقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہربات جادوکی طرح اثر کرتی ہے۔ہرلفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب نے یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی جب اپ تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے، احیاءالعلوم اپ نے رسالہ قشیریہ،قوت القلوب ابوطالب مکی کے طرز پر لکھی ہے۔چنانچہ جوعنوان قائم کیا ہے، اس کے متعلق پہلے قران مجید، پھراحادیث، پھرصحابہ، پھرتابعین کے اقوال نقل کی گئی ہیں، احیاء العلوم کے تمام قدیم وجدید تصنیفات میں ممتاز ہونے کی کچھ وجوہات اور خصوصیات ہیں،ان کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں سے چند یہ ہیں۔

نمبرایک: احیاء العلوم میں خاص کرامت یہ ہے کہ جس مضمون کوادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دل اویزی کے فلسفہ وحکمت کے معیار سے کہیں نہیں اترا ہے، یہی

وجہ ہے کہ امام رازی سے لے کر ہمارے زمانے کے سطحی واعظ تک اس سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

نمبر دو: امام صاحب کے زمانے تک فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر کتابیں پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو طلسم بنا دیا تھا، امام صاحب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فلسفہ اخلاق کے مسائل سہل ترین انداز میں بیان کئے، قاری قصہ کی طرح اس کو پڑھتا چلا جاتا ہے، اور دل پر اس کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور قاری سرتاپا اثر میں ڈوب جاتا ہے۔

نمبر تین: اخلاق کی تعلیم میں اختلافِ طبائع کا لحاظ کیا ہے، اور اس میں اعتدال کا خاص خیال رکھا ہے۔

نمبر چار: معاشرت و اخلاق کی بنیاد تمام تر مذہب پر رکھی ہے، اور اسی وجہ سے ہر عنوان کی ابتدا میں روایاتِ شرعیہ سے استناد کرتے ہیں، لیکن اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں، اور کون سے معاشرت اور کون سے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے۔

نمبر پانچ: اس میں ایشیائی قوموں میں اخلاق کے بہتر نمونہ میں جتنی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، ان کا تعلق قوتِ منفعلہ سے ہیں، اس کے مقابلہ میں شائستہ قوموں کے نزدیک اخلاق کا عمدہ معیار یہ ہے جس میں قوتِ فاعلہ کا ظہور ہو۔

ایشیائی اخلاق کا سب سے نازک مسئلہ توکل اور قناعت ہے، اس مسئلہ کی غلط فہمی نے تمام ایشیائی قوموں اور خاص طور سے مسلمانوں کو ایک مدت سے اپاہج اور نکما بنا دیا ہے، ہزاروں، لاکھوں ادمی سمجھتے ہیں کہ توکل اور قناعت کسبِ معاش چھوڑ دینے کا نام ہے، انسان کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے، وہ رازقِ مطلق ہے، اور روزی دینے کا خود ذمہ دار ہے، خود ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، اس خیال نے ہزاروں، لاکھوں ادمیوں کو مختلف صورتوں میں گداگر بنا دیا ہے، یہ مسئلہ نازک تھا، اور اس غلط فہمی

نے بہت برا اثر ڈالا تھا، امام صاحب نے اس پر نہایت مفصل و مدلل بحث عمال التوکلین کے عنوان سے کی، اس کی ابتدا اس جملہ سے کرتے ہیں:

اعلم ن العلم ورث الحال والحال ثمر ال عمال وقد ظنؔ ن معن التول ترالت سب بالبدن وتر التدب ر بالقلب والسقو ط عل ؟ ال رض الخرقة واللحم عل الوظم وذا ظن اج ال ف ن ذل حرام ف الشرع۔ علم ایک کیفیف پیدا کرتا ہے، اور کیفیت سے اعمال صادر ہوتیہیں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ توکل کے معنی یہ ہیں، کہ اکتسابِ معاش کیلئے نہ ہاتھ پاؤں ہلائے جائیں، نہ کوئی تدبیر سوچی جائے، بلکہ ادمی اس طرح بیکار پڑا رہے، جس طرح چیتھڑا زمین پر پڑا رہتا ہے یا گوشت تختہ پر رکھا ہوتا ہےلیکن یہ جاہلوں کا خیال ہے، کیوں کہ ایسا کرنا شریعت میں حرام ہے۔ توکل کی حقیقت پر امام صاحب نے ایک نہایت دقیق مضمون لکھا ہے، اس میں توکل کے جو معنی بیان کئے ہیں وہ عام خیال سے بالکل جداگانہ چیز ہے، وہ لکھتے ہیں:

توکل اصل توحید کا نام ہے، توحید کے اعتقاد سے ایک حالت طاری ہوتی ہے، اور اس حالت کی وجہ سیوہ مخصوص احوال صادر ہوتے ہیں جن کو لوگ توکل سے تعبیر کرتیہیں۔ لیکن پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ توحید کے چار درجے ہیں، زبانی اقرار، اقرارِ زبانی اور اعتقادِ قلبی، کشف کے ذریعہ یہ مشاہدہ ہونا کہ تمام افعال ذات باری سے صادر ہوتے ہیں، اسباب و وسائط کا کچھ دخل نہیں، یہ مشاہدہ ہونا کہ عالم میں ذاتِ باری کے سوا اور کوئی چیز نہیں، ان مراتب چہارگانہ میں دو پہلے مدارج کو توکل کے وجود میں کچھ دخل نہیں، توکل کی ابتداء تیسرے درجے سے شروع ہوتی ہے، یعنی جب بذریعہ کشف یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی علت صرف ذات باری ہی بیچ کے وسائط اور اسباب بالکل بیکار ہیں، جس طرح بادشاہ کوئی حکم بذریعہ تحریر کے نافذ کرتا ہے تو کاغذ، قلم اور دوات کو اس حکم کی علت نہیں کہہ سکتے، تو انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ خدا کے سوا اور وسائط و اسباب اس کی نظر سے بالکل چھپ جاتے ہیں، اس حالت میں وہ جو کچھ کہتا

ہے خدا سیکھتا ہے، جو کچھ مانگتا ہے خدا سے مانگتا ہے، اس کا نام توکل ہے۔

امام صاحب نے توکل کے جو معنی بیان کئے وہ ایک وجدانی کیفیت ہے یا حالت ہے جو اربابِ ذوق پر طاری ہوتی ہے، بے شبہ یہ حالت جس پر طاری ہو جائے وہ ظاہری اسباب سے بینیاز ہو جائیگا۔ امام صاحب کی عمر 55، 54 برس ہے، بیس برس کی عمر سے تصنیف کے مشغلے سے وابستہ رہے، دس، گیارہ سال صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں گزرا، درس و تدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا، امام صاحب کی تصنیفات بیشمار ہیں، جن میں بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں، اور ان میں گونا گوں مضامیں ہیں اور اپنے باب میں بینظیر ہیں، ان کی اجمالی فہرست درجِ ذیل ہے جو طبقات سبکی اور شرح احیاء العلوم اور کشف الظنون سے ماخوذ ہے۔

1۔ احیاء العلوم 2۔ علی مشکل الاحیاء 3۔ الاربعین 4۔ الاسماء الحسنیٰ 5۔ الاقتصاد فی الاعتقاد 6۔ الجام العلوم 7۔ اسرار معاملات الدین 8۔ اسرار الانوار الالیہ بالآیات المتلوۃ 9۔ اخلاق الابرا و الخباۃ من الاشرار 10۔ اسرار اتباع السنہ 11۔ اسرار الحروف و الکلمات 12۔ ایہا الولد 13۔ اختصار المختصر للمزنی وھو احد الکتب المشھورۃ 14۔ ہدایۃ الہدایتیہ در موعظت 15۔ بسیط در فقہ 16۔ بیان القولین للشافعی 17۔ بیان فضائح الامامیہ 18۔ بدائع الصنع 19۔ تنبیہ الغافلین 20۔ تلبیس ابلیس 21۔ تہافتہا لفلاسفہ 22۔ تعلیقہ فی فروغ المذہب 23۔ تحصین الماخذ 24۔ تحصین الادلتہ 25۔ تفرقتہ بین الاسلام والزندقہ 26۔ جواہر القرآن 27۔ حجتہ الحق 28۔ حقیقتہ الروح 29۔ خلاصتہ الرسائل الی علم المسائل فی المذاہب 30۔ الرسالتہ القدسیہ 31۔ السر المصون رتب فیہ آیات القرآن علی اسلوب غریب 32۔ شرح دائرۃ علی بن ابی طالب المسماۃ بجنتہ الاسماء 33۔ شفاء العلیل فی مسئلتہ التعلیل 34۔ عقیدۃ المصباح 35۔ عجائب صنع اللہ 36۔ عنقود المختصر و ہو تلخیص المختصر للجوینی 37۔ غایتہ الغور فی مسائل الدور فی مسئلتہ الطلاق 38۔ غور الدور الفہ ببغداد 484 ہجری 39۔ فتاویٰ مشتملتہ علی ماۃ و تسعین مسئلہ 40۔ الکفرۃ والبرۃ

41۔فواتح السور 42۔الفرق بین الصالح وغیر الصالح 43۔القانون الکلی 44۔قانون الرسول 45۔القربتہ الی اللہ 46۔القسطاس المستقیم 47۔قواعد العقائد 48۔الوقل الجمیل فی الرد علی من غیر الانجیل 49۔کیمیائے سعادت 50۔کیمیائے سعادت مختصر 51۔کشف علوم الآخرۃ 52۔کنز العدۃ 53۔اللباب المنتحل فی علم الجدل 54۔المستصفی فی اصول الفقہ 55۔منخول 56۔ماخذ فی خلاقیات بین الخلیفتہ والشافعتہ 57۔المبادی و الغایات 58۔المجالس الغزالیہ 59۔مقاصد الفلاسفتہ۔60المنقذ من الضلال 6۔معیار النظر 62۔معیار العلم فی المنطق 63۔محک النظر 64۔مشکوۃ الانوار 65۔المستظسر فی الرد علی الباطنیۃ 66۔میزان العمل 67۔مواہم الباطنیۃ 68۔المنخ ال اعلی 69۔معراج السالکین 70۔المکون فی الاصول 71۔مسلم السلاطین 72۔مفصل الخلاف فی اصول القیاس 73۔منہاج العابدین قیل ھو آخر تالفہ 74۔المعارف العقلیتہ 75۔نصیحتہ الملوک فارسی 76۔وجیز 77۔وسیط 78۔یاقوت التاویل فی التفسیر،40 جلد 2۔

ان کتابوں میں علامہ شبلی نے واقعات وجزئیات کے نقص وتحلیل کے بعد مختلف موقعوں پر جو رائیں قائم کی ہیں، ان میں بعض دفعہ قاری یا مؤرخ کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ علامہ شبلی نے اپنی کتابوں کے ذریعے سے اسلامی تاریخ، حکومت وسیاست کی بہتریں مرقع نگاری کی ہے، اردو زبان میں تاریخ نگاری کی انتہائی مہتم بالشان بنیاد اٹھائی، اور ہر تصنیف بعد کے مرحلوں میں قوی سے قوی تر ہوتی گئی، یہی علامہ شبلی کا نمایاں کارنامہ ہے۔

☆☆☆

Nisai Afsane ki nayi qaraet : Ek Dastavezi Kitab by Dr. Gulshan Abdullah

(Farashgund Budgam) cell-7006784797

ڈاکٹر گلشن عبداللہ (فراش گنڈ بڈگام، جموں وکشمیر)

نسائی افسانے کی نئی قرأت: ایک دستاویزی کتاب

Abstract

In today's literary landscape, compiling a book has become a common trend, yet at times, it serves as a crucial need. While feminist writing in Urdu literature has gained prominence, much of it remains under appreciated by critics. Moreover, existing feminist criticism in Urdu is often scattered, making it difficult for researchers and readers to access comprehensive material on the subject. Addressing this gap, young researcher Mysera Akhter has compiled Revisiting Feminist Short Story, a book that brings together critical essays by eminent scholars on feminist Urdu short stories and writers. The compiler has meticulously covered various aspects of the subject, incorporating many of her own research papers alongside a comprehensive preface, which is particularly

noteworthy.

This paper by Dr. Gulshan Abdullah critically analyses the key essays included in the book, evaluating their contributions to feminist literary criticism in Urdu.

اہم اصطلاحات:۔ نئی قرأت، نسائی ادب، تانیثی تنقید، سمن ڈی بووا، علامت، تمثیل، صنفی امتیاز، انحراف اور مزاحمت، بیانیہ اسلوب، ثقافتی مکالمہ، تنقیدی تھیری، ثقافتی اثاثہ، نفسیات، معاشرتی مسائل۔

اصل متن: کوئی بھی کتاب مرتب کرنے کا فیشن پچھلے کئی برسوں سے چلا آیا ہے۔ کہیں ہم اسے مجبوری کہیں گے اور کہیں یہ بڑے فائدے کی بھی بات ہوتی ہے جیسے اِدھر اُدھر کے مضامین یکجا کر کے اپنے نام کتاب کا کرڈٹ لے لیا۔ کچھ لوگ اکیڈمیوں کے سیمنار پیپرس وغیرہ شائع کروا کے نام اور پیسہ بٹورتے ہیں، لیکن اُردو میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ جیسے لوگوں نے جو کام مختلف کتابوں کو مرتب کر کے اور انکے ساتھ اپنے مقدمات اور مقالات جوڑ کر کے کیا، وہ اُردو کے طالبانِ علم کیلئے بڑا سود مند ثابت ہوا اور ادب کی خدمت کرنے والے مختلف اسکالروں کیلئے مشعل راہ کا کام بھی دینے لگا۔ اب اگر ہم اس تناظر میں میسرہ کا یہ کام ''نسائی افسانے کی نئی قرأت'' دیکھیں گے، تو یہ کتاب بھی اُسی guidelines پر ترتیب دے دی گئی ہے۔

سب سے پہلے یہ وقت کی ایک اہم ضرورت بھی تھی، کیونکہ یوں تو ہمارے پاس غیر شعوری طور پر نسائی ادب شروع سے ہی ملتا ہے۔ اس کے بعد جب اُردو ادب پر یورپی اثرات بڑھنے لگے، تو ان کی تحریکات اور رجحانات کے تحت بھی ہمارے یہاں اس قسم کا لٹریچر شعوری طور پر معرضِ وجود میں آنے لگا۔ عورتوں کے ساتھ سے ساتھ مرد ادیب بھی عورتوں کی مظلومیت کا اظہار کرنے لگے یا پھر مختلف طریقوں سے انکی آواز کو

بلند کرنے لگے۔مولوی نذیر احمد، حالی، رسوا اور منشی پریم چند کو سمجھنے کیلئے بڑے بڑے Brains چاہیے۔ اسکے بعد منٹو، عصمت، خدیجہ مستور سے لیکر آج تک کے ادبا جو شعوری طور پر عورتوں کے مسئلوں کو چھیڑتے ہیں۔لیکن ہم نے نسوانی زاویوں سے ان کے ادب کا مطالعہ کتنا کیا؟ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، پروفیسر شہناز نبی، صالحہ زریں اور کچھ محققین اور ناقدین کے سوا ہمارے یہاں نسائی ادب پر کیا کچھ کام ہوا ہے؟ تو اس ضرورت کے پیش نظر میّسرہ نے یہ کتاب مرتب کرڈالی، جوکہ اُردو میں نسائی تنقید کے زمرے میں ایک بڑھتا ہوا اہم قدم ہے۔دوسری طرف یہاں اُدھر سے مواد لاؤ اِدھر جمع کرلو، والا معاملہ بالکل نہیں، بلکہ مرتبہ نے پہلے موضوع کو دیکھا اور اس کے مختلف جہات پر معتبر ناقدین کے لکھے ہوئے مقالات جمع کئے اور پھر جس گوشے کی انہیں کمی محسوس ہوئی، اس خلا کو بڑے پیشہ ورانہ اور اسکالرانہ انداز میں اپنے مضامین لکھ کر دُور کیا، تو اسطرح یہ اپنے موضوع سے متعلق ایک Compact document بن گیا۔

Feminism isn't about making women stronger. Women are already strong, it's about chaning the way world perceives that strength (C.D Anderson).

نسائی افسانہ ایک منفرد اور اہم ادبی صنف ہے، جو خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی شدّت اور باریکی سے پیش کرتی ہے۔ یہ صنف عورت کی داخلی دنیا، اس کی نفسیات، جذبات، اور معاشرتی مسائل کو گہرائی سے بیان کرتی ہے،نسائی افسانے نہ صرف عورت کے داخلی وخارجی تضادات کو اُجاگر کرتے ہیں، بلکہ اس کی فکری آزادی، جذباتی کشمکش اور اپنے حقوق کے لیے جاری جدوجہد کو بھی عیاں کرتے ہیں۔اس میں عورت کی ذات کی جستجو، اس کی معصومیت، اس کے کرب اور اس کے سماجی مقام کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔نسائی افسانہ عام طور پر ان مسائل پر روشنی ڈالتا ہے، جو عورت کو سماج میں اپنی حیثیت کے حوالے سے درپیش ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں صنفی امتیاز، خواتین کی

شناخت کے مسائل، روایات سے جدوجہد کرتی ہوئی عورت کی تصویریں اوران مشکلات کا بیان ہوتا ہے جو وہ اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے لئے جھیلتی رہتی ہیں۔ ان کہانیوں میں عورت کی حساسیت اور اس کی اندرونی کشمکش کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ اس میں عصری اور روایتی دنیاؤں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو عورت کے ذہنی و جذباتی بحرانوں کو واضح کرتی ہیں۔ غرضیکہ نسائی افسانہ محض ایک صنف کے مسائل کی عکاسی نہیں کرتا، بلکہ یہ انسانی جذبات کی پیچیدگیاں اور اجتماعی حقیقتوں کا گہرا تجزیہ بھی فراہم کرتا ہے۔ ان کہانیوں میں معاشرتی اور ثقافتی حقیقتوں کو عریاں کر کے ان پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ’’نسائی افسانے کی نئی قرأت‘‘ وادیٔ کشمیر کی ایک نوجوان اسکالر میسّرہ اختر (المتخلص میّسرہ عبداللہ) کی مرتب کردہ اولین کتاب ہے۔ جس کو 2024ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی جیسے موقر اشاعتی ادارے نے منظر عام پر لایا۔ 292 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مجلد معہ گرد پوش ہے۔ کاغذ معیاری ہے اور ٹائٹل کور بھی دیدہ زیب ہے، جس میں تجریدی آرٹ میں عورت کی مظلومیت کو دکھایا گیا، جہاں سماجی طاقت انہیں منہ بند کرانے کی زبردستی کر رہا ہے۔ چونکہ عام لوگوں کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہوتا ہے، اس لئے یہاں اس پورے گراف کو شیڈس میں دکھایا گیا۔ کتاب کا بیک کور بھی بڑے پیشہ وارانہ طریقے سے تیار کیا گیا، جہاں انگریزی حرفوں میں ٹائٹل اور مرتبہ کا تعارف اُردو زبان میں سجاوٹ کیلئے ایک فریم میں بند کیا گیا۔ انہوں نے نسائی افسانے کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا مقصد نہ صرف نسائی افسانے کی تفہیم کو بڑھانا ہے بلکہ خواتین کے مسائل کو نمایاں کرنا بھی ہے۔

کتاب کے آغاز میں میسرہ اختر نے نسائی افسانے کی سمت ورفتار پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے پچاس صفحات کا ’’مقدمہ‘‘ لکھ کر نسائی افسانے کی نئی تفہیم کے لئے راہیں ہموار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا انتساب مرتبہ نے اپنے

والدین کے نام کیا ہے، جو ایک جذباتی وفکری تعلق کی غمازی کرتا ہے اور اس میں ایک لطیف ذاتی عنصر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔کتاب میں شامل مضامین خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقی صلاحیتوں، ان کے مخصوص موضوعات اور ان کی تخلیق کردہ اپنی دنیا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس کتاب کے ذریعے نسائی ادب کے ایک نئے زاویے کا آغاز ہوتا ہے، جو نہ صرف خواتین کے ادبی معیار کو بلند کرنے کی ایک قابل داد سعی ہے، بلکہ ان کی تخلیقی اُپچ اور مشاہدات کو ایک نیا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔

کتاب کی تقریظ پروفیسر عارفہ بشریٰ (سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) نے تحریر کی ہے، یہ چند سطور اس کتاب کے مستند ہونے کی دلیل پیش کرتی ہیں۔اس کتاب میں اردو ادب یا افسانے میں نسائی کرداروں کے حوالے سے جو مسائل وموضوعات زیر بحث لائے گئے، وہ نہ صرف ادب کے طالب علموں کے لیے اہم ہیں، بلکہ ان میں وہ معاشرتی سچائیاں بھی پنہاں ہیں، جو اکثر غیر محسوس رہ جاتی ہیں۔ان مضامین کا مقصد خواتین کی افسانہ نگاری کو محض ایک تفریحی یا روایتی عمل کے طور پر نہیں دیکھنا ہے، بلکہ اسے ایک فکری وثقافتی اثاثہ بھی سمجھنا ہے۔خاص بات اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ میّسرہ نے اس کا مقدمہ بہت طویل صفحہ 7 تا52 لکھ کر اپنے موضوع کا خوب سے خوب تر احاطہ کیا۔ جس میں کہانی کی ابتدا سے بات شروع کر کے فکشن کے مختلف اصناف کو وہ چھیڑتی ہے۔ اور اُردو افسانے پر کام کرنے کے سلسلے میں ان کا ماننا ہے کہ اگر چہ ہمارے افسانہ کی شروعات مردوں نے کی، لیکن دو قدم آگے بڑھ کر ہی خواتین افسانہ نگار ظاہر ہوتی ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھ کر الگ تاریخ کا متقاضی ہے۔

وہ اپنے مقدمے میں عالم تاریخ میں عورتوں کی زبوں حالی کو بیان کرتی ہے اور پھر عالمی سطح پر عورتوں کی مختلف تحریکوں کا ذکر کر کے تانیثی ادب اور تانیثی تنقید کے اُبھرنے کے محرکات کو بیان کرتی ہیں۔مختلف حوالوں سے تانیثی تنقید کا خاکہ بھی پیش کرتی ہیں۔جس سے لگتا ہے کہ میسرہ کو کس قدر اپنے Area of specialization

پر گرفت حاصل ہے اور انکی نظر بنیادی ماخذوں پر بھی ہے۔ جیسے یہاں انسائیکلو پیڈیا آف سوشالوجی، ویبسٹر ڈکشنری، سے لیکر جین اینگر اور سمن ڈی بووا Second Sex کو بھی کوٹ کیا گیا۔ اسکے بعد اُردو میں تانیثی ادب اور تنقید، ہندوستان میں اصلاحی اور سماجی تحریکات کے اثر سے آج کل کے مابعد جدیدی دور میں عورت اپنے لئے کیا کیا کچھ کر سکی، غرضیکہ ان تمام باتوں کا احاطہ اس مقدمے میں بڑے ناقدانہ انداز میں کیا گیا۔ اس مقدمے میں اُردو میں تانیثی فکشن کا بھی بھر پور جائزہ لے لیا گیا اور اپنے بیانات سے یہ باتیں اخذ کر لی گئیں کہ خواتین افسانہ نگاروں نے موجودہ دور تک اُردو ادب میں اپنے منفرد سوچ اور خیالات کا اظہار کر کے ہر ایک تحریک یا رجحان میں حصّہ لے لیا اور افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں کافی اہم رول ادا کیا۔

اب آیئے ڈالتے ہیں ایک نظر اس کتاب میں شامل چند دیگر مضامین پر بھی۔

سب سے پہلے انہوں نے پروفیسر نجمہ رحمانی صاحبہ کے مضمون ''نسائی افسانے کی منفرد آواز: زاہدہ حنا'' کو شامل کیا۔ جس میں پروفیسر صاحبہ نے انکے مختلف افسانوں (جیسے زیتون کی شاخ، نا کجا آباد اور شیریں چشموں کی تلاش وغیرہ) کے حوالے سے اپنے منفرد انداز میں ان کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ اسکے بعد اس کتاب میں شامل دوسرا اہم مقالہ ''ترنم ریاض کا 'مجسّمہ': ایک مکالمہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کا ہے۔ یہ مقالہ دراصل ترنم کے ایک افسانے ''مجسمہ'' کا پوسٹ مارٹم ہے، جس میں اس افسانے کے بیانیے اور اس میں چھیڑے گئے مختلف موضوعات کو زیر بحث لا کر ایک ہنگامہ خیز تنقیدی صورتحال کو کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ بیان ملاحظہ فرمایئے:

''......اب اگر مصنفہ (ترنم ریاض) علامتی اظہار کر کے چاہتی ہے کہ قارئین کچھ اُلجھن میں پڑ جائیں گے یا اپنے من کی بات وہ اسی مجسّسے کے ذریعے کہنا چاہتی ہے، تو اس اظہار کیلئے ایک تو ایسی زبان اور بیان چاہیے، جو بہت ہی پاور فل ہو اور دوسرا یہ کہ اس افسانے کا مرکزی کردار تمثیلی طور پر وہی مجسمہ ہونا چاہیے''۔

ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر مشتاق صدف ،ابوالکلامی قاسمی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ، پروفیسر شافع قدوائی، ڈاکٹر یاسمین، ڈاکٹر گلشن عبداللہ، نصرت جہاں، ڈاکٹر صالحہ زریّں، ڈاکٹر ظفر الاسلام اور عمران عاکف خان کے مضامین بھی اس کتاب کی زینت بن گئے۔میّسر ہ کے جو دیگر اپنے مضامین اس کتاب کے موضوع کا توازن برقرار رکھنے کیلئے لکھے گئے، ان میں (۱) ہم عصر خواتین افسانوں کے سماجی مسائل (۲) اُردو افسانے کی ایک بے باک آواز: رشید جہاں۔(۳) شائستہ فاخری کے افسانوں کا نسوانی کردار۔(۴) ترنم ریاض کے افسانوں میں کشمیر کی سماجی صورتحال (۵) قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی اور (۶) ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں موضوعات و مسائل شامل ہیں۔

اس سے پہلے بھی ہمارے نسائی افسانے کو پڑھا اور پرکھا گیا لیکن اس کتاب کے مطالعے سے ضرور لگتا ہے کہ یہاں تمام مضامین میں نئے انداز سے ان پر بات کی گئی۔گو کہ میسرہ کے ادبی سفر نے شروع میں ہی تیز رفتار پکڑ لی۔میسرہ اختر کا تعلق وادی کشمیر کے ضلع بڈگام سے ہے۔انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے بی ایڈ کی تکمیل کے بعد دہلی یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور اس وقت وہ دہلی یونیورسٹی میں ''اُردو کی خواتین فکشن نگاروں کے افسانوں میں انحراف اور مزاحمت کے رویے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ یو جی سی نیٹ/ جے آر ایف اور جے کے سیٹ جیسے معتبر اور سخت مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہو کر علمی میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔میسرہ اختر ایک متحرک اسکالر کے طور پر ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں اور اردو کے ممتاز رسائل و جرائد میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔انہیں ''نسائی ادب'' میں گہری دلچسپی ہے، اور ان کی زیرِ نظر کتاب "نسائی افسانے کی نئی قرأت" اسی فکری سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔مزید برآں، حالیہ عرصے میں میسرہ اختر نے ترجمہ کے شعبے میں بھی اپنی صلاحیتوں کا

لوہا منواتے ہوئے کشمیری زبان کے منتخب افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، جسے ''وادیٔ برف پوش'' کے عنوان سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دلی (صفحات 152) نے شائع کیا۔ کشمیری افسانوں کے اُردو ترجموں کے ساتھ ساتھ اس میں ''کشمیری افسانے'' مقدمے کے طور پر ایک پر مغز مقالہ بھی شامل کیا گیا۔

میسرہ اختر کا ایم فل مقالہ بعنوان ''سعادت حسن منٹو کے نسوانی کرداروں کا انحرافی مزاج'' قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے خواتین کے متعلق بہت سے مضامین لکھئے، جو ہندوستان کے اہم رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ میسرہ اختر نسائی لڑیچر سے خوب واقفیت رکھتی ہیں۔

''نسائی افسانے کی نئی قرآت'' ایک ایسی کتاب ہے جو اُردو ادب میں خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقی بصیرت کو سمجھنے اور ان کے افسانوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین نسائی افسانے کے حوالے سے ایک نئے انداز کی تفہیم پیش کرتے ہیں، جو نہ صرف خواتین کے مسائل کو اُجاگر کرتے ہیں، بلکہ ان کی ذہنی، سماجی، اور ثقافتی کشمکش کو بھی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ کتاب میں خواتین قلمکاروں کے افسانوں کے موضوعات، کرداروں اور بیانیہ اسلوب کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے، جس سے خواتین کے اندر کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور سماجی مسائل کا گہرا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ خاص طور پر نسائیت کی تفسیر و تعبیر کے بارے نئی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نسائی افسانہ محض صنفی مسائل تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک وسیع تر سماجی اور ثقافتی مکالمہ کی صورت اختیار کرتا ہے، جس میں خواتین کی آزادی، خودمختاری اور ان کی زندگی کی حقیقتوں کا بے لاگ اظہار ہوتا ہے۔ کتاب کے منظر عام پر آنے سے نسائی افسانے کی تفہیم میں بے حد آسانی پیدا ہوئی ہے۔ اس کے ذریعے ایک ایسا تنقیدی فریم ورک فراہم کیا گیا ہے، جو افسانوں کی گہرائی میں جا کر ان کے تخلیقی مواد اور فلسفیانہ معنی کو بخوبی سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس کتاب کی مدد سے قارئین کو نسائی افسانے کی ایک نئی اور مختلف قسم کی قرأت حاصل کرنے کا موقع ہو سکتا ہے، جو نہ صرف ادب کی تعبیرات میں اضافہ کرتا ہے، بلکہ ایک ہم آہنگ معاشرتی رویے کی تشکیل کی جانب بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نسائی افسانے کی نئی قرآت'' ایک ایسی کتاب ہے، جو ادب کی دنیا میں خواتین کی تخلیقی حیثیت اور ان کے افسانوں کی نوعیت کو جدید تنقیدی تھیوری کی روشنی میں پرکھنے کے لیے اہم حوالہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف خواتین افسانہ نگاری کے میدان میں، بلکہ وسیع تر ادبی صورتحال کے پیش نظر بھی ایک نئے تنقیدی زاویے کو متعارف کراتا ہے۔

☆☆☆

Shikayat hai mujhe Khudavandane maktab se by Dr. Manzoor Ahmad
(Assot.Prof. Dept. of Education, Kashmir University,Srinagar)cell-7006098266
ڈاکٹر منظور احمد (ایسوسیئٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم، یونیورسٹی آف کشمیر سرینگر)

شکایت ہے مجھے خداوندانِ مکتب سے

تلخیص: راقم نے اس مکالے میں علامہ اقبال کی تعلیمی فکر، رائج العمل نظامِ تعلیم پر تنقید، اور مثالی معلم و طالب علم کے تصور کو اُبھارنے واُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل انہوں نے اس جامد، مُقلِد اور بے روح تعلیمی نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا جہاں طلبہ کی فطری و تخلیقی صلاحیتوں، تجسس اور تنقیدی شعور کی پرورش ممکن نہیں۔ شکایت ہے مجھے خداوندانِ مکتب سے " علامہ اقبال کا محض ایک شعری مصرع نہیں، بلکہ انکا استعمال کیا ہوا فکری استعارہ ہے جو موجودہ اپاہج تعلیمی نظام کے لنگڑے پن کو بےنقاب کرتا ہے۔ اقبال کی شکایت ایسے مکاتب سے ہے جو خودی، روحانیت اور تخلیق کو یکسو کر کے تعلیمی اسباق یاد کرنے کے فن کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

علامہ اس نظام کی تلاش میں ہیں جہاں تعلیم کا مقصد محض علم کا حصول نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر، فرد کی خودآگہی کی تشکیل، انفرادی صلاحیتوں کی آبیاری، تنقیدی سوچ کی بڑھوتری اور روحانی تربیت و اخلاقی اقدار کی نشونما ہو۔ وہ ایک حرکی و فعال تصورِ تعلیم کی سفارش کرتے ہیں جو بچوں کے اندر خودی، خوداعتمادی، عشق، عمل اور اجتہاد کی روح تازہ کرے۔ علامہ کے مطابق استاد بطور ایک روحانی سرپرست، شخصیت ساز، روحِ انسانیت، معمارِ قوم اور شیخِ مکتب کی حثیت رکھتا ہے جسکا بنیادی کام بچوں کی رہنمائی کرنا، ان کے لئے ایسے تجربات و مواقع فراہم کرنا کہ وہ خود کو دریافت کریں، تنقیدی سوچ پالیں اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی شخصیت کی صحیح تشکیل و تکمیل عمل میں

لایں۔علامہ اقبال چاہتے تھے کہ تعلیمی ماحول ایسا ہو کہ بچے تجسس، جستجو اور تلاش کرنے کے عمل کو ناگزیر سمجھیں اور ان میں اسمانوں کی بلندیوں کو چھونے کی آرزو جگمگا اُٹھے۔

کلیدی الفاظ: تعلیم، فکر، تخیلیا ظہار۔ روحانی نشونما، مثالی معلم، خودی، نظریہ، استعداد، تعلیمی نظام، انفرادیت۔

تعارف: علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایسے بڑے شاعر، فلاسفر، دانشور، مصلح اور بلند نگاہ مفکر اور فلسفی ہیں، جو تعلیم کو فقط معلومات کی ترسیل کا ذریعہ، الفاظ کی تکرار، رٹے کی مشق، یا نصاب کی تکمیل یا معاشی ضروریات کے حصول تک ہی محدود نہیں کرتے بلکہ اسے ایک تہذیبی، اخلاقی اور تخلیقی عمل سے منسوب کرتے ہیں۔اُنکے نزدیک تعلیم کا اعلی ا مقصد فرد کی انفرادیت کو تقویت بخشنا اور مخفی وفطری صلاحیتوں ولیاقتوں کی نشونما سے منسوب ہے۔ تعلیم کا مقصد بچوں کی صحیح نشونما، تخلیق، تعلیمی سرگرمیوں وعوامل، اور قوت تخلیق اجاگر کرنے میں پنہاں ہے تاکہ وہ مادی دنیا سے پرے روحانی قدرو منزلت سے آشکار ہوں۔اقبال تعلیمی مقاصد میں صرف مادیاتی عنصر پہ ھی قناعت نہیں کرتے بلکہ روحانی پہلو بھی دیکھتے ہیں۔۔صرف بچوں کے ذہنوں تک اطلاعات پہچانا اور انکو سرگرمیہ عمل وسوچ بوجھ سے محروم رکھنا قابل تعریف نہیں۔ اقبال کی فکر، ان کا نظریہ یہی تھا کہ بچوں مین وہ ہنر و صلاحیتیں پیدا کی جایں کہ وہ ارٹ، سائنس اور علم کے ن ی وسعتوں کو سر کریں۔

علامہ اقبال کی تعلیمات کے خاص مقاصد:

- فعال تدریسی طریقہ کار۔(تعلیم کا حرکی تصور)
- خود اگہی کی تشکیل
- انفرادی صلاحیتوں کی آبیاری
- تنقیدی سوچ کی آبیاری
- اخلاقی اقدار کی نشونما۔(کردار سازی اور اخلاقی تربیت)
- استاد بطور رہبر منزل

- جامعہ تعلیم

فعال تدریسی طریقہ کار۔(تعلیم کا حرکی تصور):اقبال نے اس تدریسی طریقہ عمل کی وکالت کی جسمیں طالب علم مرکزی حثیت کا حامل ہو، جہاں بچے تعلیمی عمل میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں۔اس طریق ہ عمل میں بچے دنیاوی زندگی سے جڑے مختلف مسایل کوحل کرنے میں عملی طریقے اسعمال کرتے ہیں۔غرض علم کا اطلاق عمل میں لاکرحل کرتے ہیں۔علامہ اقبال کی فکر،اُن کا نظریہ یہی تھا کہ بچوں مین وہ ہنر وصلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ ارٹ،سائنس اورعلم کی ن یی وسعتوں کوسرکریں اوران علوم کوصرف کتابوں یا نظریاتی حدتک نہیں رکھیں، بلکہ روزمرہ زندگی، پیشہ ورانہ میدان،سائنسی تحقیق، یا سماجی مسایل ومعاملات میں عملی طور پہ استعمال کریں۔

اقبال اس فرسودہ تدریسی عمل کورد کرتا ہے جس میں سوچ وچار کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ اس طریقہ تدریس کی سراہنا کرتے ہیں جوخود فعلیت وخودسرگرمی پر مبنی ہو۔استاد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ بچوں کی خفیہ صلاحیتوں کو پہچانے، انہیں استقامت بخشے اور اُن صلاحیتوں کوحقیقی زندگی میں استعمال کرنے کی ترغیب دے۔صرف بچوں کے ذہنوں تک اطلاعات پہچانا اور انکوسرگرمیءعمل وسوج بوجھ سے محروم رکھنا قابل تعریف نہیں ہوسکتا۔اقبال کا ماننا تھا کہ بچے ہی مستقبل کے رہنما ہوتے ہین اسل ے یہ ضروری ہے کہ ان کومہارتوں وسرگرمیوں سے روشناس کرایا جائے۔ان کے نزدیک تعلیم سے انسانی ترقی مطلوب ہے۔ وہ باضابطہ تجربات پہ زور دیتے ہیں جو بچوں کی دلچسپیوں پر مبنی ہوں۔بچوں کی مہارت وتجربہ ترقی کرے تا کہ عملی زندگی میں وہ کامیاب رہیں۔

انہوں نے تدریسی عمل کے اُن طور طریقوں کوسراہا جو بچوں کوخود کام کرنے، تلاش کرنے،اورمختلف تعلیمی معمہ خودحل کرنے میں کارامد ہوں۔ایک تعلیمی ڈھانچے میں ذہنی صلاحیتوں کی نشونما پر زیادہ توجہ ملنی چاہیے۔اسی لیے علامہ تجرباتی طریقے تدریس کو اپنانے پرزور دیتے ہیں۔اس بات پہ زوردیتے ہین کہ بچے خاموش تماشائی بن کے

تعلیمی اطلاعات کورٹ رٹ کے ذہن نشین کرنے کے بجایے تعلیمی سرگرمی کا حصہ بنیں اور تعلیم وتحقیق سر کرنے میں اپنا فعال کردار نبھایں۔ ان کے نزدیک غیر تخلیقی معاشرہ ایک بانجھ معاشرہ ہے جہاں بچوں کا تخلیقی اظہار ممکن نہیں۔ اس لئے اساتزہ بچوں میں تجرباتی بنیادوں پر نئے علوم سر کرنے یا یوں کہیں کہ علم کے نئے نئے معرکے ہمت کے ساتھ طے کرنے کی لگن پیدا کریں۔ تعلیمی ماحول ایسا ہو کہ بچے تجسس، جستجو اور تلاش کرنے کے عمل کو ناگزیر سمجھیں اور ان میں اسمانوں کی بلندیوں کو چھونے کی ارزو جاگ اُٹھے۔

اسی لیے علامہ اقبال اس بات پہ زور دیتے ہین کہ بچے خاموش تماشائی بن کے تعلیمی اطلاعات ومعلومات کورٹ رٹ کے ذہن نشین کرنے کے بجایے تعلیمی سرگرمیوں کا حصہ بنیں اور تعلیم وتحقیق سر کرنے میں اپنا فعال کردار نبھایے۔ وہ اس بات پہ کافی زور دیتے کہ ایک بچے کی نشونما ایک ازادانہ اور تخلیقی ماحول میں نشونما پایے۔ وہ اس علم کو ترجیہات مین رکھتے جو تجرباتی بنیادوں پہ ممکن ہو۔ ان کے نزدیک غیر تخلیقی معاشرہ ایک بانجھ معاشرہ ہے جہاں بچوں کا تخلیقی اظہار ممکن نہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اسی لیے اساتذہ بچوں میں تجرباتی بنیادوں پر نئے علوم سر کرنے کی لگن پیدا کریں تاکہ وہ علم کے نئے نئے معرکے ہمت کے ساتھ طے کریں۔

اخلاقی اقدار کی نشونما، کردار سازی اور اخلاقی تربیت:

علامہ اقبال تعلیمی مقاصد میں صرف مادیاتی مقاصد پہ ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ روحانی پہلو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ چاہتے کہ کتابی علوم کے علاوہ بچوں میں اخلاقی اقدار و طرز عمل بھی اجاگر کیا جاے۔ انہوں نے بچوں کے ضابطہ اخلاق کی اہمیت پہ کافی زور دیا اور اس نقطہ کو اُبھارا کہ استاد بطور مثالی کردار اپنایے تاکہ بچوں میں اچھے اطوار پیدا ہوں اور وہ مادی دنیا سے پرے روحانی قدر ومنزلت سے اشکارا ہو جای ں۔

خود آگہی کی تشکیل: علامہ اقبال ایک ایسے تعلیمی نظام کی سراہنا کرتے تھے جہاں بچوں کی نشونما اس طرح ہو کہ وہ خود آگہی یعنی شعورِ ذات حاصل کریں اور اخلاقی اعتبار سے بالا تر اور با مقصد بنیں۔ انہوں نے چاہا کہ بچے رائجل عمل تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی اقدار کو بھی مستحکم کریں۔ بچے سچ تلاش کریں، سماج کے لیے فایدہ بخش بنیں اور اپنے آپ میں قایدانہ صلاحیتیں استوار کریں۔ ایسے تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہمہ جہت و ہمہ گیر تعلیم کو سراہا جو صرف کتابی نہ ہو بلکہ جسکی عملی اہمیت ہو۔

علامہ اقبال نے انسان کی عظمت و حیثیت کو مان کر اسے اللہ تعالی! کی تخلیق کردہ مخلوقات میں سب سے اعلیٰ ا اور افضل جانا۔ وہ عظمت آدم سے اشنا تھے اور آدمی کے بیشمار ممکنہ عروج پر انہیں یقین قوی تھا، اسی لئے کہتے ہیں کہ:

عروجِ آدمی خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارامہِ کامل نہ بن جائے

بچوں کے پاس بیش بہا صلاحیتیں موجود ہیں جنہیں پہچاننے اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنی ذاتی و تخلیقی ہنر کا لحاظ کریں، غیر فعالیت کا مصداق نہ بنیں اور مذہبی و روحانی بصارت حاصل کریں۔ علامہ اقبال چاہتے کہ طلباء غیر معمولی، مثالی کردار اپنایں کہ ساری دنیا کی تخلیق، تطہیر و تکمیل میں وہ اللہ کے معاون و مددگار ثابت ہوں۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال کے مطابق تعلیم کا صحیح مقصد بچوں کو راہنمائی فراہم کرنا، حوصلہ افزائی عطا کرنا تا کہ وہ خود شناسی کے عمل کو یقینی بنایں۔ بس خود شناسی ان اعلیٰ صفات کا شعور کہلاتی ہے جو آدمی کی اصل ماہیت، ساخت یا روح سے تعبیر ہو۔

تنقیدی سوچ کی آبیاری: تعلیمی نظام کو نئی تحقیقات و تجربات سے منسلک کرنے کی اشد

ضرورت ہے تا کہ بچوں میں تنقیدی سوچ پیدا کی جائے اور وہ نئے نئے حالات و واقعات سے نمٹنے کے لئے تیار رہیں اوران حالات سے مثبت مطابقت وہم آہنگی پیدا کریں۔استاد بچوں کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ انہیں تلاش کرنے،استفسار کرنے، جایزہ لینے، تجزیہ کرنے،اوراپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی ترغیب ملے اوروہ معلومات واطلاعات کو بغیر جانچے تسلیم نہ کریں۔علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ تعلیمی طور طریقے ایسے اپنائے جانے چاہیے کہ بچوں میں تنقیدی رویےاوروجانات پیدا ہوں۔ بچے فکری و ذہنی طور منجمند نہ رہیں بلکہ نئے نئے تعلیمی وعلمی زینے تسخیر کریں۔

بچوں میں تجسس وتخلیقی روجانات اجاگرکرنے کے لئے ان کوسیکھنے کےعمل کوفطرت سے جوڑ دینا یامنسوب کیا جانا چاہیے نہ کہ بچے اپنے تعلیمی تجربات صرف کلاس روم تک ہی محدود رکھیں۔

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوت کوہ وبیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش
کھول آنکھ زمیں دیکھ،فلک دیکھ،فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کوزرا دیکھ

انفرادی صلاحیتوں کی نشونما: علامہ اقبال کے مطابق بچے مختلف ومنفرد ہنر، روجہانات و صلاحیتوں سے اراستہ ہوتے ہیں،اس لیے اس بات پہ زور دیتے ہیں کہ وہ خودافروزی یعنی اپنی مخفی صلاحیتوں کو پہچاننے کی کوشش کریں۔اقبال کی نظر میں تعلیم کیاعلیٰ مقاصد میں بچوں کی مخصوص انفرادی قوتوں کی نشونما کرنا، ہنرمند و باصلاحیت شخصیتیں تیار کرنا ہے۔تعلیمی مقاصد کا پورا ہونا بچوں کی صحیح نشونما کرنے،قوت تخلیق اجاگر کرنے اوران کے لیے سودمند اورتعلیمی سرگرمیاں آراستہ کرنے میں پنہاں ہے۔استاد بطورمعاوِن کام کرے تا کہ بچے اپنے ذاتی ہنر وصلاحیتوں کو دریافت کریں اور سیکھنے کے عمل میں بڑی سرگرمی سے شامل ہوجائیں۔استاد کو چاہیے کہ وہ ایسی تعلیمی سرگرمیان بچوں کیلے مرتب کرے جہاں انکو یہ آزادی ملے کہ وہ اپنے ماحول کو دیکھیں، جانچیں اور پرکھیں

تا کہ براہ راست تجربات حاصل کریں۔ ایسے مواقع بچوں کو فراہم کیے جانے چاہیے تا کہ انکی انفر دیت پروان چڑھے ایک استاد بچوں کو محض علم سے ہی فیضیاب نہیں کرتا بلکہ اُنکے اخلاق ونظریات بھی تشکیل دیتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیمی سرگرمیاں بچے کو بھر پور مدد کریں کہ انکی خفیہ و پوشیدہ صلاحیتوں کی نشاندی عمل میں لای ی جاے۔ انکے مطابق :

"بقاے دوام پہلے ہی موجود ہے مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے"

اساتذہ بچوں کے لئے وہ تجربات ومواقع فراہم کریں کہ وہ اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی شخصیت کی صحیح تشکیل و تکمیل عمل میں لائیں۔ اقبال کے مطابق، جہاں بچوں کی منفرد ومخصوص شخصیتوں کا نسوونما تعلیمی سرگرمیوں سے ممکن نہ ہو وہاں صحیح تعلیمی مقاصد کا پورا ہونا دور کی بات ہے۔ علامہ کے مطابق تعلیم کا اعلیٰ ا مقصد فرد کی انفرادیت کو تقویت بخشنا ہے تا کہ وہ اپنی استعداد ومخفی صلاحیتوں، فطری لیاقتوں اور ذہنی قواء کی بھر پور نشوونما پاے۔ تخلیقی صلاحیتیں جو آدمی کی بلند اوصاف میں گنی جاتی ہیں، ایک آزادانہ ماحول میں ہی پنپ سکتی ہیں۔ اس لیے بچے کو اپنی صلاحیتیں کھوجنے، جانچنے و پرکھنے کی آزادی دی جانی چاہیے۔ تب ہی وہ زندگی کے پیچیدہ ومشکل حالات کا سامنا خوش اسلوبی سے کرسکتا ہے۔

آدمی ذہنی تخلیقی وروحانی صفات سے سرفراز ہے اور کلچر وثقافت، اخلاقیات و مذہب اسی قوت کا مظہر ہے۔ آفاقی اقدار سچائی، خوبصورتی واچھائی سب انسان کی تخلیق کردہ چیزیں قرار دی جاتی ہیں۔ اقبال کے مطابق تعلیم کا صحیح مقصد اپنے گردونواح کو تسخیر کرنے میں مضمر ہے۔ دنیا کی تقلید کرنے یا تسلیم کرنے کے بجاے آدمی اس کو بدلنے یا نئے سرے سے تشکیل دینے کی سعی کرے۔ آدمی کی صحیح پہچان اس کی اعلی! روحانی صلاحیتوں کو جاننے سے تعبیر ہے نہ کہ مادی صفات کے پہچاننے سے۔

اُستاد بطور رہبر منزل: سارے نظام تعلیم میں استاد کی حثیت بطورِ ایک روحانی سرپرست ،شخصیت ساز، روحِ انسانیت ،معمار قوم اور شیخِ مکتب ہے، جس کا بنیادی کام بچوں کی

رہنمایی کرنا کہ وہ خودکو دریافت کریں اورتنقیدی سوچ پالیں۔تاکہ وہ تعلیمی معلومات و حقایق کو بغیرتحقیق کے قبول نہ کریں۔استاد ایک معاون وصلاہ کار کی حثیت رکھتا ہے جو بچوں کی جسمانی، ذہنی وروحانی تربیت میں پیش پیش ہو۔اساتزہ سعی کریں کہ بچےتفکراور تزکرکو اپنا کراسان کامل بنیں۔ اس ضمن میں انہیں چاہیے کہ ایسی نئ وضع کردہ تعلیمی سرگرمیاں منتخب کریں جوبچوں کی ضروریات اورشوق وذوق پرمبنی ہوں۔تعلیمی سرگرمیوں کومرتب کرنے کے دوران استادکو چاہیے کہ وہ بچوں کی انفرادیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ ماحول کی ہیت کا بھی تجزیہ کریں۔اقبال کا ماننا ہے کہ بچے کی انفرادیت کانشوونما تب تک ممکن نہیں جب تک انہیں براہ است اپنے ماحول سے شناسائی نہ ہو۔اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں سے اپنے ماحول کی صحیح پہچان کرائیں تاکہ ان کواس پرراغب کیا جائے کہ وہ یعنی بچے اس ماحول کا صحیح تجزیہ، ناقدانہ ومبصرانہ طورپہ کریں۔

اقبال موجودہ زمانے کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنے کیلیے موجودہ سائنسی تعلیم کو فروغ دینا چاہتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ انسان بطورخلیفہ یااللہ کے جانشین کی حیثیت سے ساری کائنات کوفتح کرنے میں حصہ لے۔بچوں کوصحیح رہنمائی وتعلیم وتربیت چاہیے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں واہلیتوں کا ممکنہ حدتک نشوونما پائیں اورتخلیقی حس وکارآمد ہنر حاصل کریں۔

کمالِ عشق ومستی ہے معلم کی سرشت میں کہ ہوطلبہ کاقلب بھی روشن چراغ سے

جامعہ تعلیم: علامہ اقبال کی نظر میں تعلیم صرف کتابی علوم تک ہی محدودنہیں رہنی چاہیے بلکہ اس میں بچوں کی سماجی وروحانی نشونمابھی شامل ہونی چاہیے۔اوراستاد بچے کی ہمہ جہت نشوونما کے حصول میں پیش پیش ہونا چاہیے۔2020 قومی تعلیمی پالیسی بچے کی ہمہ گیر نشوونما پراسرارکرتی ہے جس میں بچے ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی، اخلاقی نشوونمابھی حاصل کریں، نیزتکنیکی علوم سے بھی ہمکنار ہوں۔علامہ اقبال نے تعلیم کے اسی پہلوکو اجاگرکرنے کے لئے اپنی بات نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

تعلیمی نصاب کا مواد مذہب، تاریخ، سائنس اور تکنیکی علوم پر مبنی ہونا چاہیے۔ مذہب کو سائنس کے ساتھ جوڑ کر ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ اقبال نے متوازن تعلیمی نظریہ کی وکالت کی جہاں ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی نشوونما کی بھی بات ہو۔ لہذا اگر متوازن، ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیات کو پیدا کرنا مقصود ہو تو تعلیم مذہبی، اخلاقی، شعوری و جمالیاتی نشوونما فراہم کرنے پر ذہن مرکوز ہونا چاہیے۔

اختتامیہ: علامہ اقبال تعلیم کے کثیر جہتی معنیٰ پر زور دیتے ہیں۔ اُنکی نظر میں تعلیم صرف حصولِ معلومات یا نوکری ہی نہیں، بلکہ تعلیم انسان کی روحانی، فکری، اخلاقی اور عملی زندگی کی تکمیل کا پُر اثر ذریعہ ہے۔ اُن کے نزدیک تعلیم وہ" قوتِ محرکہ " ہے جو شعور ذات، مخفی صلاحیتوں کی نشونما اور روحانی تربیت کے حصول میں کام آتی ہے۔ صحیح تعلیم وہ عمل ہے جو تقلید و جمود کو نہیں بلکہ تحقیق، تخلیق و جستجو کو اُجاگر کرے۔ بچے ارٹ، سائنس و دیگر تیکنیکی علوم کی وسعتوں کو سر خر کرنے کی آرزو رکھیں تا کہ انہیں مختلف شعبہ ءجات میں اپنی صلاحیتیں کھوجنے، جانچنے اور پرکھنے کے مواقع فراہم ہوں اور معلم طلبہ میں صرف نصابی علم ہی نہیں بلکہ اخلاقی شعور و روحانی بیداری، شعورِ ذات، شاہینی صفات اور جذبہء فکر و تحقیق و تخلیق سے سرشار و منور کرے۔

حوالہ جات:

۱): اقبال، محمد۔(1935)۔ بالِ جبریل. لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔

۲): فتح پوری، فرمان۔(2010)۔ اقبال سب کیلیے۔ ایجوکیشنل پبلشیگ ہاوس، دہلی

۳): خان، محمد امین۔(2008)۔ اقبال کا تعلیمی فلسفہ: ایک تحقیقی مطالعہ، علی گڑھ: ادارہ تحقیقاتی اسلامی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۴)۔ خان، حبیب الرحمان (1998)۔ اقبال کا تعلیمی فلسفہ اور اس کا اطلاق۔ علیگڑھ: مکتبہ جامعہ

۵)۔زیدی، محمد سلیم ۔(2003)۔اقبال: فکرو تعلیم کے ایٔینے میں۔ دہلی: فروغِ ادب اکادمی۔
۶)۔وحید، محمد عارف ۔(2010)۔اقبال اور نظامِ تعلیم جدید۔ پٹنہ: بہار اُردو اکادمی۔
۷)۔• فاروقی، ڈاکٹر افتخار۔ (2011). اقبال کا فلسفہ ؟ تعلیم اور عصرِ حاضر کے تقاضے. لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔
۸)۔ شبیر، محمد۔(2007).اقبال اور تعلیم: نظری اور عملی پہلو. لاہور: دارالفکر۔

☆☆☆

Salam bin Razzaq ke Afsano mein Siyasi-o- Samaji Masael ki Akkasi by
Shakeela Akhter (research scholar,dept. of Urdu Central University of
Kashmir, Gandarbal) cell-7006707957

شکیلا اختر (ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو سینٹرل یونیورسٹی اف کشمیر، گاندربل)

سلام بن رزاق کے افسانوں میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی اردو ادب بالخصوص اردو افسانے کے لئیا یک عہد ساز دور ثابت ہوا۔اس دہائی میں جدیدیت کا رجحان تیزی سے نمود پانے لگا۔جس کی ابتدائی بازگشت اگرچہ 1955 کے بعد سنائی دینے لگی تھی۔تاہم اس کی فکری اساس اور فنی شناخت 1960 کے بعد ہی واضح ہوئی۔یہ وہ وقت تھاجب ایک طرف ترقی پسندتحریک اپنے عروج پرتھی اور افسانے میں موضوع اور مواد کو بنیادی اہمیت دی جارہی تھی ،وہی دوسری طرف جدیدیت کےعلمبرداروں نے اسلوب اورطرزِ بیان کی تجدید پر زور دینے کے ساتھ ساتھ فرد کی داخلی کشمکش ،تنہائی ،ڈر،خوف ،ذہنی انتشار اور معاشرتی اقدار کے زوال جیسے دقیق موضوعات کو اپنے افسانوں کا محور بنایا۔ان کے اسلوب میں پختگی اورجدت نے اردو افسانے کو ایک نئی سمت دی تاہم یہ رجحان جلد ہی تجریدیت ،ابہام اورعلامتی پیچیدگیوں کی زد میں اگیا۔اس رجحان کے تحت لکھنے والوں کے یہاں سماجی مسائل کا فقدان ہوگیا۔وہ فرد اور اپنے ہی حصار میں مقید ہوکر رہ گئے۔جس کی وجہ سے'افسانہ'عام قاری کی سمجھ سے بالا تر ہوگیا۔لیکن 1970 کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل نے ان دونوں انتہاوں سےشعوری انحراف کرتے ہوئے اردو افسانے کے لئے ایک نئی جہت تلاش کی ۔انھوں نہ صرف افسانے کوفنی سطح پرنکھارنے کی سعی کی بلکہ کہانی پن کوازسرنواہمیت دے کرافسانے کواس کی اصل روح اور جمالیاتی شناخت سے

ہم آہنگ کردیا۔سید محمد اشرف،انور خان ، سلام بن رزاق، شوکت حیات،شفق،انور قمر،حسین الحق،عبد الصمد،طارق چھتاری،انیس رفیع،خالد جاوید،غضنفر، بیگ احساس وغیرہ اس فہرست میں شامل ہیں۔اس ضمن میں سلام بن رزاق لکھتے ہیں:

''آج کا افسانہ(1970 کے بعد کا) ترقی پسندوں کی اشگاف مقصدیت اور جدیدیوں کی تنہائی کے کرب والی مریضانہ ذہنیت دونوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔اج کا افسانہ نگار کھلی ڈلی فضا میں سانس لینے کا قائل نظر آتا ہے وہ دوراز کارتجربون کے نام پر اپنی روایت کی صحت مند قدروں کو فراموش نہیں کرتا۔اسے تجربوں سے گریز نہیں کیونکہ تجربہ روایت کی کوکھ ہی سے جنم لیتا ہے۔ادب اور ارٹ میں صحت روایتیں مرتی نہیں ان کا اواگون ہوتا رہتا ہے۔''(شاکر تسنیم،سلام بن رزاق اپنے افسانوں کے ائینے میں،مکتب صدف،مظفر پور2013،ص,10)

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اردو ادبی منظر نامے پر ابھرنے والے جن ادیبوں نے اردو افسانہ کا رُخ بدل ڈالا اور اسیا یک نئی سمت اور جہت عطا کی ان میں سلام بن رزاق کا نام سرفہرست ہے۔اردو دنیا انھیں ایک معتبر افسانہ نگار،مضمون نگار کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز ترجمہ نگار کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔اصل نام شیخ عبدالسلام (2024۔1941ء) تھا۔لیکن ادبی دنیا میں 'سلام بن رزاق' کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔سلام بن رزاق اگرچہ شاعری کے ذریعے ادب میں داخل ہوئے لیکن بہت جلد ان کی تخلیقی جبّلت نے انہیں یہ باور کرادیا کہ ان کا حقیقی فنی اظہار کا میدان نثر خصوصاً افسانہ نگاری ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''رین کوٹ''1962 میں ماہنامہ 'شاعر' میں شائع ہوا،جس نے ادبی حلقوں میں ان کی امد کا بھرپور اعلان کردیا۔اس کے بعد وہ افسانیلکھتے رہے اور ان کی کہانیاں مختلف رسائل اور جرائد میں متواتر شائع ہوتے رہے،جس کے نتیجے میں ان کے چار افسانوی مجموعے 'ننگی دوپہر کا سپاہی(1977)،مُعبّر(1978)،شکستہ بتوں کے درمیان(2003)،زندگی افسانہ

نہیں(2012) کے نام سے شائع ہوئے، جو جدید افسانہ نگاری میں اہم اضافہ ہیں۔
بقول غضنفر: ’’سلام بن رزاق نے اس زمانے میں بھی کہانی کو کہانی بنائے رکھنے میں اہم کردار نبھایا جس عہد نے کہانی سے کہانی پن کو دور کرنے کا پوری طرح من بنالیا تھا۔جس نے کہانی کاروں کے دماغوں میں کچھ ایسا خیال پیوست کر دیا تھا کہ کہانی اگر سمجھ میں اگئی تو وہ کہانی نہیں رہ پائے گی۔اچھی کہانی وہ ہے جو اسانی سے کھلے نہیں اور کھلے بھی تو صاف صاف دکھائی نہ دے‘‘ (غضنفر،سلام کی سادگی کو سلام، گوشہ سلام بن رزاق، مشمولہ اردو دنیا، دہلی، شمارہ 7، جلد:26، جولائی، 2020،ص35)

سلام بن رزاق کا شمار اگرچہ زمانی لحاظ سے مابعد جدیدیت کیافسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔تاہم ان کی تخلیقی شخصیت کسی ایک مخصوص دبستانِ فکر یا نظریاتی سانچے کی اسیر نہیں رہی۔انھوں نے ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مثبت اقدار سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے فن کی تعمیر وتشکیل کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانوی کائنات موضوعاتی سطح پر متنوع اور رنگا رنگ ہیں۔موضوع کے پیش نظر چونکہ یہاں سلام بن رزاق کے افسانوں میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی کے حوالے گفتگو کرنا مقصود ہیں اس لیے جب ہم سلام بن رزاق کے افسانوی کینوس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے یہاں محض کہانی گوئی مقصود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تاریک گوشوں میں اتر جانے والی وہ لطیف اور تہہ دار تحریریں ہیں جو دُکھ، درد والم، محرومی، سماجی بے حسی، سیاسی جبر واستحصال، اقتصادی بحران، مذہبی انتہا پسندی سے پیدا شدہ حالات میں شکست وریخت سے دوچار ہوتی انسانی زندگی اور اس کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو ایک تجربہ بناتی ہیں۔ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی ہی نہیں بلکہ عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جزبہ کارفرما ہے۔سلام بن رزاق نے اپنے پہلے افسانوں مجموعے’’ننگی دوپہر کا سپاہی‘‘ میں ہی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ عام زندگی کے نا اشکار پہلوؤں کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی سعی میں مصروف

ہیں۔انھوں نے سماج کے بے نام و بے زبان کرداروں کو اپنے افسانوں کا ہیرو بنا کر ان کیجذبات اور احساسات کو اپنا ذاتی تجربہ بنا کر اس طرح پیش کیا کہ وہ قاری کو خود اپنی وارداتِ قلبی معلوم ہوتی ہے۔چنانچہ سلام بن رزاق خود کہتے ہیں:

’’میری ذات سے میرے کردار وجود میں اتے ہیں اور میر یکرداروں سیمل کر ہی میری ذات مکمل ہوتی ہے۔غالب نے قطرے میں دریا اور جزو میں کُل کی حقیقت دریافت کی تھی۔میں اپنی ذات کے ائینے میں اپنے اطراف کے لوگوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں۔ان کی محبتیں ،ان کی نفرتیں ، ان کی شرافت،ان کے سرکشی ا،ان کی بزدلی،ان کے سکھ ان کے دکھ،غم وغصّہ،سختی اور نرمی سب میرے ہی جذبے کے مختلف عکس ہیں۔‘‘

سلام بن رزاق کے چاروں افسانوی مجموعوں کی بیشتر کہانیاں عصری دور کے سیاسی نظام کی خرابیاں اور اس کے سبب پیش انے والے سماجی مسائل اور خانگی اُلجھنوں کی متحرک تصویریں پیش کرتے ہیں۔جن میں زنجیر ہلانے والے، بیعت ، کالے ناگ کا پجاری،ننگی دوپہر کا سپاہی،انجام کار وغیرہ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، یہ افسانیان کی فکری حساسیت اور مشاہداتی باریکی کے مظہر ہیں ،جو ایک ایسے سماج کا عکس پیش کرتے ہے جہاں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔افسانہ ’’زنجیر ہلانے والے‘‘ کو لیجئے اس کے ذریعہ سلام بن رزاق نے برسر اقدار سیاسی قیادت کی ناکامی اور امرانہ روش کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی کے عہد کی فضا ، اس کے خوفناک اثرات اور انسانی شعور پر پڑھنے والے اثرات کو ایک فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔افسانے میں انجانا خوف ہر طرف دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف ایمرجنسی کے جبر امیز سیاسی ماحول کا ائینہ ہے بلکہ انسان کے اجتماعی لاشعور میں پیوست خوف، بے یقینی اور اضطراب کی پیچیدہ کیفیات کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے۔چاروں طرف پھلیی ہوئی ہولنا کی نے لوگوں کو اس قدر مضطرب کر دیا کہ زنجیر کے ہلنے کی آواز سے لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل اتے

ہیں۔لیکن یہ پتہ لگانے سے قاصر ہیں کہ زنجیر کو کس نے ہلایا؟۔۔۔۔اور محض گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔ یہ اس معاشرتی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے جو جبّر کے سایے میں پروان چڑھی ہیں۔ یہی دہشت اور پُراسراریت کی کیفیت ''کالے ناگ کے پُجاری''، ''معبر''، ''دست بریدہ لوگ'' جیسے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ 'کالے ناگ کے پجاری' کے ذریعے مذہبی، اخلاقی اور روحانی زوال کو عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا۔ یہ افسانہ صحیح معنوں میں انسانی بربریت اور انسانی بے توقیری کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے اور انسانی برتری کی طرف قاری کی توجہ بھی مبذول کرتا ہے۔ افسانہ 'مُعبر' اپنے بُنت، موضوعی ندرت، موزوں علامت، فکری اور بلیغ مکالمے کے اعتبار سے سلام بن رزاق کا عمدہ افسانہ ہے۔ 'معبر' معنوی سطح پر ایک کثیر الجہتات استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔ افسانے کی رمزّیت کو موثر بنانے کے لئے جابجا استعاروں اور علامتوں کا سہارا لیا گیا۔ مرکزی کردار 'مُعبر' کو محض اس بنیاد پر عدالت کی طرف سے سزائے موت سنائی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے۔ بہ ظاہر یہ کوئی ایسا جُرم نہیں ہے جس کی سزا دی جائے۔ عدالت کہتی ہے ''ہاں خوابوں کی تعبیر بتانا ہمارے نزدیک ناقابل معافی جُرم ہے'' یہ دراصل اس سماجی وسیاسی نظام پر ایک بھرپور طنز ہے جو شعور اور فکری بیداری سے خوفزدہ ہے۔ یہاں 'معبر' ایک رمز شناس شخص کا استعارہ ہے جو لوگوں کو ناانصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ اقتدار کی حقیقتِ حال سے اشنا کرتا ہے۔ اس لئے اقتدار پرست لوگوں کو اس کی باتیں خطرے کی باعث لگتی ہیں۔ 'معبر' کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے جب جلاد آتا ہے تب مُعبر کو یہ اشکار ہوجاتا ہے کی اسے قید کرنے والا سپاہی، فیصلہ دینے والا جج اور پھانسی پر لٹکانے والا جلاد دراصل ایک ہی شخص کے الگ الگ روپ ہیں۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یعنی میرا شبہ سچ نکلا۔'' قیدی کے ہونٹوں پر ایک بے باک مسکراہٹ تھی۔

''کیسا شبہ؟'' جلاّد کے لہجے میں ہلکی سی کپکپی تھی۔

’’دراصل تم، جج اور سپاہی یہ تینوں ایک ہی شخص کے تین الگ الگ روپ ہو۔اومیرے گلے میں پھندا ڈال دو۔تم دیکھوگے کہ میں کتنے اطمینان سے مرتا ہوں۔کیونکہ میرے اخری خواب کی تعبیر بھی سچ نکلی۔‘‘

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قانون، قانون کے محافظ اور مصنف تینوں ایک ہی ذہنیت کے ہیں اس لئے انہیں بے گناہوں کو مجرم بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔افسانے کے اختتامی جملے میں مُعبر کی موت سے بے خوفی دراصل اس کے عرفانہ شعور کی علامت ہے کہ اب وہ پوری نظامِ حکومت کی اصلیت کو پہچان چکا ہے۔ اس سطح پر اکر مُعبر ایک فرد کی حد سے نکل مزاحمت کی علامت بن جاتا ہے۔

سلام بن رزاق کے افسانے ایسی علامتی وفکری تحریریں ہیں جو سیاسی شعور ، ریاستی جبر اور فرد کی بے بسی کو فنکارانہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں سیاست صرف حکمرانی یا اقتدار کا کھیل نہیں بلکہ ایک باطنی کرب ہے جو فرد اور سماج دونوں کی ساخت کو متاثر کرتا ہے۔اس سلسلے میں ان کا افسانہ ’’دست بریدہ لوگ‘‘ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ سلام بن رزاق کے فکری افق اور سماجی شعور کا ایک درخشاں نمونہ ہے، جو استحصالی نظام کی تحت زندگی گزارنے والے محنت کش طبقوں ،کسانوں اور مزدوروں کی الم ناک صورتِ حال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔افسانہ کا بنیادی استعارہ کہ فاقہ کشی اور بھوک کی شدّت انسان کو اس حد تک بے بس کرتی ہے کہ دو مٹھی اناج کے عوض اپنا ہاتھ کٹوانے پر آمادہ ہوجاتا ہے ، یہ درحقیقت انسانی وقار ،آزادی اور محنت کی علامتوں کی قربانی ہے، جو نظام کے ظالمانہ ڈھانچے کے تحت ممکن ہوئی ہے۔دو مٹھی اناج کے عوض ہاتھ کٹوانے کا واقعہ یہاں علامت بن کر ابھرتا ہے کہ وہ ہاتھ جو محنت، خودداری اور اختیار کی علامت تھے، اب استحصالی قوتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔سلام بن رزاق نے افسانے میں اس سیاسی خامشی کو بھی گرفت میں لیا ہے جو محکوم طبقات پر اس طرح مسلط ہے کہ ظلم اور محکومی ان کی جبلّت کا حصہ بن چکے ہیں۔ ریاستی جبر اور سرمایہ دارانہ مفاد کی ہم

آہنگی نے ان کی زبان چھین لی اور شعور کو اس نہج پر لا کر کھڑا کیا کہ وہ احتجاج کو گناہ اور بغاوت کو بربادی سمجھنے لگے ہیں۔

سلام بن رزاق خود متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے اپنے اس پاس کے حالات ومسائل کو ایک فنکار کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک ذہین، سنجیدہ اور حساس شخصیت کے دل ودماغ سے محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں اسی طبقے کے کردار اور ان کے گرد گھومتی ہوئی زندگی کے مسائل کو بنیادی حیثیت حاصل ہیں۔ان کے افسانوں کا سماجی پس منظر نہ صرف ہندوستانی معاشرے کی پیچیدگیوں کو عیاں کرتا ہے، بلکہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ سماج کی ظاہری ساخت کے پیچھے کتنے چھپے تضادات موجود ہیں۔انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے سماج کے اس غریب فرد کو پیش کیا جو ہمیشہ ظلم وزیاتی اور ناانصافیوں کا شکار ہوتا رہا ہے اور جس کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔اس کا اندازہ افسانہ یک لویہ، قصہ دیو جانس، کام دھینو، بیعت، ستی اور انجام کار سے ہوتا ہیں۔'بیعت' میں سلام بن رزاق نے موجودہ دور کے انسان کی داخلی کشمکش، جبر کے خلاف فرد کی مزاحمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدے داروں کی بد عنوایاں اور ان کے ماتحت ملازمین کی بے بسی کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔افسانے کا مرکزی کردار ایک خود مختار زندگی کا تمنائی ہے، اسی لئے ملازمت کے دوران افیسر کے ذریعے دیئے گئے نوٹس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔لیکن افیسر کے اس دھمکی آمیز جملے کہ ''تم نے اس کے عواقب پر بھی غور کیا ہے؟'' سے اس کے قوت ارادی میں اضمحلال در آتا ہے کہ اگر وہ نوٹس پر دستخط نہیں کرے گا تو اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ملازمت کے چھوٹ جانے اور بیوی بچّوں کی کفالت کا خیال آتے ہی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نوٹس پر دستخط کر دیتا ہے۔افسانے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں کیبن کی چق ہٹا کر اندر جاتا ہوں۔ایک جوڑی تیز آنکھیں میرے دماغ کا ایکس رے لے رہی ہیں۔

کیا سوچا ہے؟

میں چپ رہتا ہوں۔

میری انکھیں پیپرویٹ کے شیشے میں قید چھوٹی سی گڑیا پر جمی ہیں۔دوبارہ وہی سوال۔۔۔۔

میں دستخط کرنے آیا ہوں۔''

(ننگی دوپہر کا سپاہی ،سلام بن رزاق،مشمولہ،افسانہ''بیعت''، نیورائٹر پبلیکیشنز، پائپ روڈ کرلا ممبئی ء1977،ص٦٦)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غیر منصفانہ نظام میں ضمیر کی آواز اکثر مجبوریوں کے شور میں دب جاتی ہے۔افسرانِ بالا کی دھونس، ماتحت کی مجبوری اور معاشی دباو کے آگے فرد کی خوداری بلا اخر شکست کھا جاتی ہے۔یہی صورت حال افسانہ ''انجام کار''میں ہے۔افسانہ ایک مخصوص واقعہ کو بیانہ کا مرکز بناتے ہوئے اس کے ذریعے ایک پورے نظام کی خامیوں کو بے نقاب کرتا ہے، جوآج کے شہری سماج میں فرد کی بے بسی اور ریاستی اداروں کی غیر فعالیت کی ایک زندہ مثال ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ایک متوسط طبقے کا کلرک ہے جو اپنی نئی بیاہتائی بیوی کے ہمراہ نہرونگر کی کسی کھولی بستی میں رہنے آتا ہے۔کلرک کا کرداراس متوسط طبقے کی علامت ہے جو دیانت،قانون پسندی اور ریاستی اداروں پر اعتماد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوتا ہے۔اس کے گھر کے باہر گندی پانی کی نکاسی کے لئے نالی غیر قانونی سرگرمی یعنی دیسی شراب کی بوتلیں چُھپانے کا عمل دراصل سماج میں سرایت کیے ہوئے غیر رسمی جرائیم نیٹ ورک کی نمائندگی کرتا جس کا سرپرست شامودادا جیسے مقامی غنڈے کرتے ہیں جو سیاسی سرپرستی اور پولیس کی ملی بھگت کے سبب ناقابل گرفت رہتے ہیں۔اس غیر قانونی عمل پر افسانے کا مرکزی کردار صدائے احتجاج بلند کرتا ہے ،تو ابتداء میں اس کا سامنا صرف ایک چھوکرے سے ہوتا ہے مگر جلد ہی اس کے پیچھے شامودادا جیسا پُرتشدد اور طاقتور کردار اکھڑا ہوتا

ہے۔ یہ ترتیب نہایت معنی خیز ہے۔ کیونکہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جرم کبھی تنہا نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک مکمل طاقت کا ڈھانچہ موجود ہوتا ہے۔ پولیس کی بے عملی نہ صرف ریاستینظام کی ناکامی کو اشکار کرتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ بااثر افراد قانون سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ پولیس انسپکٹر کی جانب سے کہی گئی بات ''ہم اس کو گرفتار کر سکتے ہیں مگر وہ کل ہی چھوٹ جائے گا، اور تمہیں وہی رہنا ہے'' دراصل قانون کے متوازی موجود ایک غیر رسمی سیاسی وسماجی نظام کی موجودگی کو ثابت کرتی ہے جو انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ افسانے کے اخر میں راوی کا پُر سکون لہجے میں ''پاو سیر موسمبی اور ایک سوڈا مانگنا'' محض فرمایش نہیں ، بلکہ اجتمائی جبّر کے خلاف ایک خاموش اور مہذب مزاحمت کا اظہار ہے۔ شامو دادا کا حیرت سے دیکھنا اور ہاتھ سے لنگی کا چھور چھوٹ جانا دراصل اس طاقت کے بُت کا لمحاتی لز جانا ہے جو ہمیشہ بے زبانوں کے سہمے وجود سے اپنی سلطنت تعمیر کرتا رہا ہے۔

سلام بن رزاق نے اپنے افسانوی تخیل کو صرف مقامی وقومی مسائل تک محدود نہیں رکھا بلکہ عالمی سطح کے پیچیدہ معاملات کو بھی موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ 'ندی' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ 'ندی' حیات انسانی کا ایک ایسا عکس جمیل ہے جو اپنی گہرائیوں میں کثیف سماجی و سیاسی حقیقتوں کا اشوب چھپائے ہوا ہے۔ اگر چہ افسانہ بظاہر سادے سے منظر نامے کو پیش کرتا ہے، لیکن اپنی تہوں میں منافرت کی آہنی دیوار کو مسمار کرنے اور اافاقی اتحاد کی شدید خواہش بھی سموئے ہوا ہے۔ ندی معنوی اعتبار ایک وسیع تر ارضی پیکر کی علامت ہے اور اس میں رہنے والے مینڈک کو سیاسی نیتاؤں کا استعارہ بنا کر پیش کیا گیا۔ ندی کا چھوٹے چھوٹے ٹاپوں میں تقسیم ہونا دراصل کرہ ارض کو الگ الگ مما لک، خطوں اور صوبوں میں تقسیم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور ان ٹاپوں پر قابض مینڈکوں محض جانور نہیں بلکہ ہمارے سیاسی منظر نامے کے وہ کردار ہیں جو چھوٹے چھوٹے ٹاپوں پر قابض ہو کر اقتدار کی ہوس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالتے رہتے

ہیں۔جس طرح مینڈک دوہری زندگی (خشکی وتری) بسر کرتے ہیں،اسی طرح ہمارے سیاسی قائدین بھی دوغلّے پن اور منافقت کی زندگی جیتے ہیں، جہاں قول وفعل میں تضاد ایک مستقل رویہ بن چکا ہے۔ ندی میں مچھلیاں ان عناصر کی علامت ہے جو دیانت ،صداقت اوراخلاص کے پیکر ہیں۔ یہ مچھلیاں ان تمام تعفن زدہ رویوں،چیخ وپکاراور موقع پرستی سے یکسر مختلف ایک الگ تہذیبی حوالہ بن جاتی ہے۔مچھلیوں کا کردار دراصل ان باشعوراور حساس اذہان کا استعارہ ہے جومعاشرتی گراوٹ اور سیاسی منافرت کے خلاف آواز بلند تو کرنا چاہتے ہیں،مگر ماحول کی گھٹن ان کے لئے سانس لینا بھی دشوار کردیتی ہے۔افسانے کے اخر میں مگر مچھ کو مصلح ،مدّبر اور سچّائی کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جو مینڈکوں کو حقیقت کا ائینہ دکھاتا ہے۔مینڈک اگرچہ مگر مچھ کی ظاہری طور پر عزّت کرتے ہے اور اسے اپنا مرّبی ورہنما تسلیم کرتے ہیں لیکن جونہی وہ ان کی نفاق، جہالت اور سطحی سوچ کی نشاندہی کرتا ہے تو وہ سب خفا ہوجاتی ہیں۔مگر مچھ کی دعا پر مینڈکوں کا غائب ہوجانا اس امر کی علامت ہے کہ ہمارا معاشرہ سچ،اتحاد،شعور اور اخوت کو قبول کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ اس سے مفاد پرست طبقے کی حکمرانی خطرے میں پڑتے ہے۔غرض یہ افسانہ علامتی انداز میں سیاسی استبداد ،فکری زوال اور سماجی منافرت پر گہرا طنز ہے۔آزادی کے بعد ہندستان میں فسادات کا سلسلہ ایک مستقل المیہ بن کر رہ گیا اور کہیں نہ کہیں اج بھی ذات پات، مذہب اور مسلک کے نام پر یہ فسادات جاری وساری ہیں۔ دیگر اصناف کے مقابلے میں اس موضوع پر کثرت سے افسانے لکھے گئے۔اور جس طرح افسانہ نگاروں نے فسادات کے مختلف پہلوں کو آشکار کیا اسکی کوئی مثال دستیاب نہیں ہیں۔سلام بن رزاق کے یہاں بھی اس موضوع پر نصف درجن افسانے ملتے ہیں۔جن میں ایک طرف فسادات کے مناظر کی عکاسی ملتی ہیں وہی دوسری طرف فسادات سے قبل پیدا شدہ حالات اور فسادات کے مابعد لوگوں کے ذہنوں پر پڑنے والے خطرناک اثرات کا عکس بھی نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں چادر، دودِ چراغ، باہم ،اندھی میں چراغ

،چہرہ ،اندیشہ،زمین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں فسادات کی الگ الگ نوعیت کو پیش کیا گیا۔

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کی سلام بن رزاق کے افسانوں میں زبان و بیان کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ان کی افسانے قاری کے ذہن میں نہ صرف فکری سوالات کوجنم دیتے ہیں بلکہ داخلی سطح پر ایک گہری کشمکش بھی پیدا کرتے ہیں، جوکسی بھی افسانہ نگار کی ایک اہم فنی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔ان کے افسانوں کا موضوعاتی کینوس سیاسی وسماجی مسائل اور وجودی کرب پر پھیلا ہوا ہے، جس میں کئی قسم کے تخلیقی رنگ نظر اتے ہیں۔اور ساتھ ہی کردار نگاری میں کسی بھی کردار کی تخلیقی ساخت فنی چابکدستی کی ماہرانہ عکاسی کرتی ہے، کیونکہ وہ کردار نہ صرف افسانوی کردار ہونے کا حق ادا کرتے ہیں بلکہ پیامی سطح پر اپنے لب و لہجے اور عمل سے سیاسی ،سماجی یا طبقاتی موضوعات ومسائل کی فنی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔المختصر انہوں نے جس فنی مہارت سے اپنے افسانوی بیانیہ کو صفحہ قرطاس کے سُپرد کیا وہ واقعی ان کے ایک کامیاب تخلیق کار ہونے کی ضمانت ہے۔

☆☆☆

Ali Abbas Husaini ke Afsano mein samaj aur uske masael by Aafiya Negar (Research Scholar,dept. of Urdu Purvanchal University,Jaunpur)

عافیہ نگار(ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو، پروانچل یونیورسٹی، جونپور)

علی عباس حسینی کے افسانوں میں سماج اور اس کے مسائل

علی عباس حسینی کے دستیاب شدہ افسانوں کا تحلیل و تجزیہ ان کے اندر پیش کئے گئے مسائل کے حوالے سے آئندہ صفحات پر الگ الگ عناوین کے تحت کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانے سماج کے کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ علی عباس حسینی کے معتد بہ افسانے ایسے ہیں جہاں ایک سے زیادہ سماجی مسائل کہانی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض افسانے ایک سے زیادہ عناوین میں موجود ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد: علی عباس حسینی کے چھ افسانے: گاؤں کی لاج، ملاپ، کچھ لالہ و گل، چناؤ، دو شریفوں کا مقابلہ، اپریل فول وغیرہ اتحاد کے خمیر سے تیار کئے گئے ہیں اور اتفاق سے گاؤں کی لاج، ملاپ، چناؤ اور دو شریفوں کا مقابلہ دیہات میں موجود ہندوستان کی ان دو اہم قوموں پر مرکوز ہے۔ کچھ لالہ گل اور اپریل فول ایسے افسانے ہیں جو شہری فضا میں تیار کئے گئے ہیں۔ ''اپریل فول'' میں روح افسانہ بیوقوف بنانے کے مذموم عمل پر روشنی ڈالنا تھا لیکن علی عباس حسینی نے اس افسانے کے دو اہم کردار کو ہندو مسلم کے دو بچوں کے طور پر پیش کیا ہے جن کے گھروں میں حد درجہ مغائرت تھی لیکن ان بچوں کی آپسی دوستی نے غیریت کی اس کھائی کو کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''سارا کالج جانتا تھا کہ مدھوسودن اور مشتاق میں بڑی گہری دوستی ہے۔ بالکل ایک

جان دو قالب والا معاملہ ہے۔ چوبی اور دامن کا ساتھ، پڑھائی کے درجوں میں ساتھ، کھیل کے میدانوں میں ساتھ، مباحثے میں ساتھ، مطالعے میں ساتھ، ایک ساتھ اپنے گھروں سے نکلتے، ایک ساتھ اپنے اپنے مکانوں میں پلٹتے، گھر بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے، بس گلی بیچ میں تھی۔ وہ بھی اتنی ہی چوڑی کہ ایک چھلانگ میں پار کرلی جائے۔ مگر یہ سارا ساتھ ساری یک رنگی مدھو اور مشتاق کی ذات ہی تک تھی۔ ورنہ مدھو کے پتا جی بڑے بڑے ودوانوں کے گرو تھے۔ شاستروں کا جاننے والا ان سے بڑا کوئی برہمن نہ تھا۔ اپنے ہی شہر میں نہیں بلکہ دور دور کے شہروں میں بھی ہون کرانے وہی بلائے جاتے۔ مت اور دھرم کی باتوں میں ان کا فیصلہ آخر ہوتا۔ آج سے نہیں بلکہ سات پیڑھیوں سے ان کا خاندان آس پاس کے رجواڑوں کا گرو تھا۔ ادھر مشتاق کے والد جامع مسجد کے پیش نماز تھے اور عربی جامعہ کے مدرس اعلیٰ۔ ہر وقت یا تو کلام مجید کی تلاوت کرتے یا دینیات کا درس دیتے۔ اس لئے ہمسایہ ہونے پر بھی دونوں گھروں میں کوئی نقطہ مشترک نہ تھا، جہاں دونوں ملتے۔ یہ دو خاندان کیا تھے، دو چٹانیں تھیں جن کے درمیان بے رنگی اور غیر ہمسائیگی کی ایک گہری ندی بہہ رہی تھی۔ لیکن مدھو اور مشتاق نے پہلے تو اس درمیانی خلیج کو پھاند کر دوستی کی، پھر دونوں کے اخلاص نے اس خلاء پر ایک پل سا بنا دیا اور اس کے دونوں سروں پر اخوت کے دو چراغ جلا دیئے، جنھیں نہ جھکڑ بجھا سکے اور نہ آندھیاں گل کرسکیں اور تو دونوں گھر ایسے ملے جیسے وید و قرآن۔ ظاہر میں تو سنسکرت اور عربی کی لفظوں کے لفظوں کا فرق مگر باطن میں وہی اللہ اور برہما کی وحدانیت۔'' [۱]

علی عباس حسینی جس گاؤں میں پلے بڑھے ہیں وہاں اس طرح کے امور سے جڑے لوگ زیادہ تو ہندو ہی ہوتے تھے۔ اب قدریں یکسر بدل چکی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی پر مرکوز افسانے:

علی عباس حسینی سر جب تک مدرسی کے پیشے سے منسلک تھے [۲]۔ اس لئے

انھوں نے ایسے افسانے نہیں لکھے جس سے انگریزی سرکار کی مخالفت کی بوآئے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ انگریزوں کے کفش بردار ہو گئے ہوں۔ ان کی تحریروں میں جا بجا انگریزوں کی حکمت عملی، آداب زندگی اوران کے ذریعہ اختیار کئے گئے انسانیت کے دوہرے معیاروں پر ڈھکے چھپے لفظوں میں اور کبھی کبھی علی الاعلان تیکھے ردعمل بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بٹّی اور بدلہ ایسے افسانے ہیں جن میں انگریزوں کو سامنے رکھ کر ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت پر شدید چوٹ کی ہے، لیکن انگریروں کو احساس نہیں ہونے دیا ہے۔ نوکری میں رہنے کی وجہ سے علی عباس حسینی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ انگریزوں کو سیدھے سیدھے ہدف بناتے انھوں نے بڑی چابکدستی سے ظالم کا ذکر کئے بغیر مظلوم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ہدف کو حاصل کیا ہے۔

انگریزوں کی مخالفت پر مبنی افسانے: انگریزوں کے مظالم اوران کی حکومت کے خلاف ملک کی عوام کے ردعمل کے حوالے سے علی عباس حسینی کے کم از کم چار افسانے ''پوتر سندور''، ''باغی بیوی''، ''ہمارا گاؤں'' اور ''ملاپ'' ہیں۔ اس میں انگریزوں کے مظالم کو بیان کیا ہے اور انگریزوں کی سب سے زیادہ مخالفت مسلمانوں نے کی، انگریزوں کے شکار بھی وہی ہوئے، جائیداد بھی ضبط کر دیا گیا۔ اس طرح کے واقعات صرف کہانی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کی فارسی کی عالمی شہرت یافتہ شخصیت پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے بزروں کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آ چا تھا۔ آپ کے جد اعلیٰ میر معلیٰ زیدی الواسطی ساکن بجولی ضلع اعظم گڑھ، باون مواضع کے معافی دار مالک تھے۔ میر معلیٰ کی تمام املاک انگریزوں نے ضبط کر لی تو انھوں نے مضافات کے چار گاؤں خرید لئے۔ جن میں سے ایک کیدلی پور بھی تھا جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی۔''[3]

بابائے قوم مہاتما گاندھی: علی عباس حسینی گاندھی جب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ملک کو آزاد کرانے کی ان کی مہم اور سعی نے موصوف حسینی کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ گاندھی جی سے اس وابستگی کے نتیجہ میں مانجھی اور شیو کا باغ جیسی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ بابائے قوم

سے اپنے قلبی لگاؤ اور احترام کا ذکر خود ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

’’گاندھی جی کی زندگی میں ان کی اہنسا اور ان کے دوسرے نظریات کی حمایت میں کہانیاں لکھیں۔ مثلاً: مانجھی، اڈا، ہمارا گاؤں وغیرہ ہے ان کی موت پر شیو کا لاغ لکھا را اور اس وقت لکھا جب کہ اردو، ہندی، انگریزی زبانوں میں نہ ان پر کوئی نظم لکھی گئی اور نہ کوئی فسانہ۔‘‘(3)

ہمارا گاؤں اور لیڈر اس موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ علی عباس حسینی نے جدوجہد آزادی اور انقلاب کی تحریک کے بطن میں فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والوں کو بے نقاب کیا اور تنگ ذہنیت والے سیاست مداروں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے تار و پود بکھیر نے شروع کر دیئے۔ ہمارا گاؤں میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’چمار ٹولی میں سکھوں، دھنپت، سہدیو، نرپیتا کھاٹ پر بیٹھے ناریل پی رہے تھے۔ سکھوں نے ہوائی اڈے پر کام کر کے اپنی حالت سنوار لی تھی، حال ہی میں وہ گورکھپور مہا سبھا کے جلسے میں بھی ہو آیا تھا۔ اب اس کے تیور خاصے تیکھے تھے۔ دھنپت نے کسان کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس نے بڑے بڑے نیتاؤں کے درشن کے لئے تھے۔ اس نے ان کی جوشیلی تقریریں اپنے کانوں سے سنی تھیں اور ان کے وعدوں پر اسے پورا یقین تھا۔ وہ اپنی جلد بازی میں بار بار یہی سوچتا جب سب کچھ ہمارا ہی ہے تو ہم ان زمینداروں سے کیوں دبیں، کیوں نہ ابھی سے مار پیٹ کر سب چھین لیں۔ نرپیتا گولر کا کیڑا تھا۔ صدیوں کے چمار کا نمونہ، ان تمام صفات نیک و بد کا مالک جنھوں نے چمار کو چمار بنا رکھا ہے۔ سکھوں نے کہا: دادا تم گورکھپور نہیں چلے، نہیں تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ پرکھے اس دیش کے راجا تھے۔‘‘[4]

لیڈر افسانے میں عوام کو تشدد پسند بنانے کے لئے علی عباس حسینی جس طرح کا کردار وضع کرتے ہیں وہ کیفیت حقیقت سے قریب تر ہے وہ لکھتے ہیں:

’’آدمیوں کے اس جنگا کو مہاشے جی کے درشنوں کا بڑا شوق تھا۔ اور یہی

مذ بہ بے اختیار گلوں کا پھندا بن کر سب کو بہرام نگر کھینچ لایا تھا۔ مہاشے جی تھے بھی انھیں بس ایک ہی دھن تھی، جس طرح ہو مظلوم کسانوں کو ظالم اور خونخوار زمینداروں کے پنجوں سے چھڑانا چاہئے۔ اس عفریت مآب جماعت نے بھوکے کسانوں کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔ کسانوں کو جو واقعی مفلس اور فاقہ کش تھے ''مہاشے جی'' نئے اوتار جان پڑے۔ انھوں نے ان کے قدم کی خاک کو سرمہ چشم بنایا اور ان کے منھ سے نکلے ہوئے شبدوں کو وید کے منتروں کی طرح دلوں میں جگہ دی۔ وہ مہاشے جی کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس طرح پی جاتے تھے، جس طرح سوکھی زمین پہلے پانی کی بوندیں جذب کر لیتی ہے۔ جھونپڑے میں رہنے والے کسانوں کو پہلی بار محلوں کا خواب دکھائی دینے لگا تھا۔ کسان سنگھ کے مقامی سکریٹری نے ایڈریس پیش کیا اور مہاشے جی نے جے جے کے فلک شگاف نعروں میں تقری شروع کی۔ تقریر کیا تھی سرمایہ داروں کے ہاتھوں کچلی ہوئی انسانیت کے آنسوؤں کا دریا تھا وہ مدوجزر، وہ اتار چڑھاؤ کہ اللہ تیری پناہ، تان اس پر ٹوٹی کہ زمیندار کسانوں کا خون پی پی کر موٹے ہوتے جاتے ہیں ان کا قلع قمع کر دو، ان کا گھر پھونک دو، ان سے زمینداریاں چھین لو یہ اگر بیوی بچوں کا خیال دلائیں تو کہہ دو تمہاری بیویاں ناگنیں اور تمہارے سنپولے ہیں۔ ان موذیوں کے مرجانے میں ملک کی رکشا ہے۔'' [5]

''لاٹھی پوجا'' اس میں متوسط طبقے کی ایک بیوہ عورت کی زندگی کا ذکر ہے۔

''بیوہ کے روپئے مار لینا کون سی بڑی بات ہے۔ ہریا کو اس زمانے میں یہ بڑی سختی سے محسوس ہوا کہ بغیر اپنے مرد کے ایک تنہا عورت کے لئے زندگی بڑی دشوار ہے۔'' [6]

''آم کا پھل'' افسانے میں نچلے طبقے میں مصیبتوں سے جوجھتی ہوئی عورت کی بے بسی کو پیش کیا ہے۔

''بدلیا ایک چمارن تھی'' اپریل میں گونا کرا کر سسرال آئی اور جون میں

ٹھاکر کی بیگار نے اسے دلہن کی جگہ بیوہ بنا دیا تھا۔ پتی کو چھ کوس ٹھیک دوپہر میں شہر تک ننگے پاؤں جانا پڑا۔ زمیندار کا حکم موت کی طرح ٹالا نہ جاسکتا تھا۔ پلٹنے میں لوگی اور گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی جلتی بھنتی زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بدلیا نے مانگ کا سیندور دھو ڈالا۔ رنگین ساری اتار کر وہ پھٹی پرانی ساری پہن لی جس کے سوا اس کے پاس جسم ڈھانکنے کو اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اور کئی وقت مارے رنج کے ایک دانہ تک منھ میں نہ ڈالا۔ لیکن اس سوگ منانے سے ساس نندوں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ انھوں نے اسے ڈائن، گھر اجاڑن اور بھن پھیر ٹھہرا دیا اور اسے اپنے پھوس کے محل سے نکال کر بیلوں کے چھپر میں جگہ دی، تاکہ اس کا منحوس سایہ ان کی پوتر پر نہ پڑے۔ یہیں ایک کھاٹ پر بدلیا پڑی رہتی تھی۔ دن رات میں ساس نندوں میں سے کسی کا اگر جی چاہا تو وہ اسے تھوڑا سا ستو، مٹھی بھر چنا، یا تھوڑے سے مٹر دے جاتیں۔ ورنہ وہ تھی، بیل تھے، مچھر تھے، گوبر تھا اور سڑے ہوئے بھوسے کی بو۔‘‘[7]

علی عباس حسینی کے افسانوں میں اہم رشتے: علی عباس حسینی کے افسانوں میں عورت کی شخصیت اور فعالیت کے مختلف پہلو ہیں۔ خونی رشتوں کے بندھن میں بندھی عورت کے گیارہ رویوں میں سے، علی عباس حسینی نے افسانوں میں سب سے زیادہ ماں کو پیش کیا ہے، چالیس سے زیادہ افسانوں میں عورت بہ حیثیت ماں کا ذکر ہے۔ بیٹی: خونی رشتوں میں ماں کے بعد کہانیوں میں جگہ بنانے والا کردار بیٹی کا ہے۔ چھبیس افسانے ایسے ہیں جن میں وہ شامل ہے۔ اس کردار میں تو کوئی ایسا چونکا دینے والا پہلو نہیں سوائے دو ایک افسانوں کے جن میں نورونار ہے۔ اس کہانی کے ضمن میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

’’نورونار مجھے اس لئے پسند ہے کہ یہ بڑی حد تک الہامی ہے۔ میں کئی دن سے اس فکر میں تھا کہ میں کسی افسانے میں بیوی کا وہ تخیل پیش کروں جو مذہب اسلام میں ہے۔ دقت یہ تھی کہ جو پلاٹ ذہن میں آتا وہ ایک تبلیغی چیز بن جاتا، اسی اڈھیڑ بن میں نماز ظہر پڑھ رہا تھا کہ ذہن میں یہ کہانی آئی، اس لئے میں اسے ادھر کی دین سمجھتا ہوں۔‘‘[8]

بہن: ماں اور بیٹی کے بعد خونی رشتے میں عورت بہن کی شکل میں نظر آتی ہے۔
علی عباس حسینی کے جتنے افسانوی مجموعے دستیاب ہو سکے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے گیارہ افسانے ایسے ہیں جن میں عورت بہ حیثیت بہن موجود ہے۔

بیوی: علی عباس حسینی کے افسانوں میں بیوی کے حوالے سے لونڈی اور باندی جیسے لفظ کی تکرار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے تقریباً باون برس تک افسانے لکھے۔ اس مدت میں ان کے افسانوں میں عورت الگ الگ حیثیت سے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عورت کے بہت سے روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لونڈی باندی کے تصور کی موجودگی ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح ہے: سب سے پہلا افسانہ پژمردہ کلیاں بنام باسی پھول ۱۹۱۸ء [۲۸] کے درمیان تحریر کیا جاتا ہے باسی پھول میں عورت بہ حیثیت محبوبہ کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''صابرہ مائی ہوئی آئی، لیکن تنہا میں ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ نظریں نیچی کئے سر جھکائے اس طرح کھڑی رہی جیسے کوئی کنیز آقا کے حکم کی منتظر ہو۔'' [۹]

سات سال بعد ۱۹۲۵ء گرمی کا مہینہ، نینی تال کا عارضی قیام اور اس دوران دوسرا افسانہ جذب کامل تحریر کیا جاتا ہے جو زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوتا ہے [۳۰] اس کی ایک عبارت لونڈی کے تصور کو کچھ اس طرح بیان کر رہی ہے۔

''میں نے پوچھا: ارے جب یہی تھا تو پھر ایک سال کامل مجھے اس طرح دہکتے انگاروں میں، بھڑکتے شعلوں میں کیوں چھوڑ رکھا تھا۔ وہ بولی: ہائے رے نادانی اگر ایسا نہ ہوتا تو تم میں اور مکھر جی میں فرق کیسے ہوتا، کھوٹے کھرے کا امتحان منظور تھا، سو دیکھ لیا۔ سوامی اب تیری باندی ہوں، جان و دل زندگی و حشر و نشر سب تیرے ہاتھ میں ہیں، جو تیرا جی چاہے تو کر اور ان سے ہاتھ جوڑ کر میرے پیر چھوئے اور میں نے کانٹ کر ان بندھے ہاتھوں کو چوم لیا۔'' [10]

حسن رہ گذر: علی عباس حسینی نے اس افسانہ میں ایرانی افراد کو موضوع بنایا

ہے۔انھوں نے اپنے مخصوص انداز نگارش، تقابل، مثال، عبارت آرائی وغیرہ سے رنگ بھرے ہیں۔مغربی دانشوروں، فرائڈ، مارکس، لینن اوراسٹالن کے نظریوں پر چند جملوں میں پوری تاریخ سمیٹ دی ہے۔فرائد کے جنسی نظریات کے پس منظر میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگراس کا فلسفہ کلیتہً صحیح مان لیا جائے تو سارا نظام ہی بدل جائے۔اور مارکسسٹ نظریہ تو بالکل پامال ہوکر رہ جائے۔لیکن وہ بھی کہاں مکمل ہے۔دیکھو نہ روس کو لینن نے اسے کیا سے کیا بنادیا، اوراسٹالن اسے کہاں سے کہاں لے گیا۔''[11]

انھوں نے اہل روس کی کھل کر تعریف کی اور معلّی کے اپنے خاص مضمون ''تاریخ'' سے اپنے رشتہ کا اعلان کیا اور انھوں نے لکھا:

''مگر صاحب یہ روس والے بھی بلا کے لڑنے والے نکلے کیا استقلال ہے، کیا پامردی، کیا جانفروشی، ہے اور کیا وطن پروری۔''[12]

اسی جگہ سے علی عباس حسینی نے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک اوراس سے وابستہ شاعروں پر کھل کر اظہار رائے کیا ہے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود اور ترقی پسند تحریک کے ۱۹۳۶ء کے لکھنؤ میں منعقد ہونے والے پہلے اجلاس جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی اس میں شرکت کرنے[13] پر بھی بعد کے سرخیل ترقی پسندوں نے علی عباس حسینی کو ''حرف غلط'' کی طرح مٹادیا۔کیونکہ اس تحریک میں دوطرح کے لوگ شامل تھے۔وہ لوگ جو سرکاری ملازم نہیں تھے، دوسرے وہ افراد جو سرکاری ملازم تھے۔یہ تحریک جب تک خالص ادبی تحریک ہونے کا نقاب اوڑھے تھی اس میں بلاتفریق سبھی شریک تھے خواہ نوکری پیشہ ہو یا آزاد انسان۔لیکن جب ادبی تحریک نے سیاسی اور انقلابی شکل اختیار کرلی[14] تو سرکاری نوکری پیشہ افراد کے لئے عملی طور پر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود اس کو اس سے وابستہ رکھ سکیں۔دوسری طرف نظریاتی اختلاف نے بھی شدت پکڑی۔آزادی بیان کی حدوں کا تعین نہیں ہوا تھا۔[15]۔اظہار رائے کی حدیں ہوتی

ہیں، ان نقطہ پر بھی دانشوروں میں خاصا اختلاف تھا۔ایک طرف نو جوان جن میں جوش اور حدود کی عدم پاسداری [16] اور دوسری طرف معتدل مزاج دانشور۔دونوں کے فکری تصادم میں وہ معتدل افراد جن کا مطمح نظر ادبی تشخص، شہرت، نام آوری نہیں تھا بلکہ قلم کے ذریعہ انسان کو فکری اور مادی غذا فراہم کرانا تھا یعنی انسان، ادب اور سماج کی خدمت تھی وہ چند مہتو کانکشی یعنی مطلب پرست، حریص اور خود غرض حاشیہ برداروں کی وجہ سے تحریک کے حاشیہ پر چلے گئے۔علی عباس حسین بھی انھیں میں سے ایک تھے۔انھوں نے تحریک سے وابستگی کو درخور اعتنا نہ سمجھا بلکہ شخصیت کے اصلی جوہر کو پسند کیا۔روسی جوان مردی کی توصیف میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''بڑی اچھی نظم کہی ہے علی سردار جعفری نے کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکنے لگے دل، لیکن اگر اس میں آزاد نظم کی قید نہ لگی ہوتی تو لاجواب چیز ہوتی۔مگر یہ آزاد و مقید نظم کی بحث بھی خوب ہے۔میرے جیسے کرم خوردہ ملی کیا کریں، ایک میں اپنی بیوی کی سی یکسانیت دوسری میں ہمسائے کی دلہن کی سی جاذبیت۔کس کو چھوڑوں، کس کو اپناؤں، ایک طرف لکھنوی اثر واختر تلہری، دوسری جانب احتشام ماہلی و علی جواد زیدی، پھر ترقی پسندوں کا پورا گروہ سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور کپتان فیض۔نہ جانے ان حضرات کا نام اس قدر غیر شاعرانہ کیوں کر کھا گیا کہ قافیہ پیمائی بغیر وکالت کے ممکن ہی نہیں۔کہیں اس لئے تو وہ ردیف و قافیہ سے نہیں گھبراتے لیکن وہ بھی کتنا خوب ہے ظالم۔ کلام میں کیف بھی ہے، مغز بھی اور صفائی و تسلسل بھی۔ن م راشد بھی ذہین ہیں جدت و تنوع بھی ان کے یہاں ہے لیکن خدا جانے کیوں الہامیات کی طرح اپنے نام اور کلام میں مقطعات کی شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔اور وہ جو حضرات ہیں ان کے کلام میں اور کبھی کبھی ندرت بھی مگر اس پر مچلتے ہیں کہ نظم کو آزاد کریں گے۔کیا حافظہ ہے واللہ میرا ان کا نام ہی نہیں یاد آیا۔بھلا سا تو ہے، کچھ ملّا جیون سا، ہاں ہاں یاد آیا میرا جی۔'' [17]

ریل کے سفر: علی عباس حسینی اپنے افسانے میں ریل کا سفر، جوش کی نظر، جنگل

کی شاہزادی[18] کی حسین دوشیزہ کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی سماجی زبوں کو پیش کیے ہیں۔جس طرح پٹریوں پر دوڑتی ریل گاڑی پٹریاں بدل لیتی ہے اسی سرعت سے جوش کی نظم کی حسین دوشیزہ سے ہندوستان کی مفلوک الحال، غربت زدہ، فاقہ مست، نحیف و لاغر عوام کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

''لیکن جوش کی دوشیزہ کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ تو اس کالے کلوٹے بھوکے ننگے قبل از وقت بوڑھے ملک میں قسمتوں ہی سے نظر آتی ہیں۔ یہاں نہ تو عورتیں ہوتی ہیں، نہ مرد، نہ دوشیزگی ہوتی ہے، نہ جوانی۔اس ملک میں تو صرف ہڈی کے ڈھانچے ہوتے ہیں۔''[19]

جل پری: ہمارا گاؤں افسانوی مجموعہ کا دسواں اور آخری افسانہ ''جل پری'' ہے۔''جل پری'' افسانہ تخیلاتی واقعات پر مبنی، حقیقت سے پرے کی کہانی ہے جس پر اردو کی اہم داستانوں، طلسم، ہوش ربا اور الف لیلیٰ کے اثرات نمایاں ہیں۔اس حقیقت کو اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نیند کی دیوی آئی مگر خراماں خراماں اور دل و دماغ میں اپنے جھولے ڈالنے کی جگہ بس پلکوں کو چھو کر چلی گئی۔ میں الف لیلہ کا سوتا جاگتا ہارون بن گیا۔''[20]

علی عباس حسینی کے افسانوی مجموعے: باسی پھول، ہمارا گاؤں، ایک حمام میں، آئی سی ایس، کچھ ہنسی نہیں ہے اور میلہ گھومنی وغیرہ کے افسانوں میں بختیارک کا نسخہ (آئی سی ایس) اور جل پری (ہمارا گاؤں) یہ دو افسانے ایسے ہیں جن کی بافت خالص تخیلاتی ہے۔''جل پری'' افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے عزیز فاطمہ اپنی کتاب اردو افسانہ ''دوسری جنگ عظیم سے آزادی ہند تک'' میں لکھتی ہیں:

''علی عباس حسینی کے افسانے ''رحیم بابا'' اور ''جل پری'' زندگی کے مختلف گوشوں کی مصوری ہیں۔لیکن یہ افسانے اصلاح سیاسی پختگی اور چاؤ کے مظہر ہونے کے باوجود بنیادی طور پر کہانیاں ہی کہے جا سکتے ہیں۔''[21]

حواشی: [۱] آئی سی ایس، صفحہ ۱۰۰، افسانہ بیلوں کی جوڑی۔[2] ہمارا گاؤں، صفحہ

۲۰۷،افسانہ جل پری۔[3] آئی سی ایس۔صفحہ ۸۷۔[4] ایک حمام میں،صفحہ ۷۴، ۷۵۔افسانہ اپریل فول۔[5]ماہنامہ ’’کتاب‘‘حسینی نمبر سال ۳،شمارہ ۱۱، ۱۲۔دسمبر۔

[6]عابدی نامہ،صفحہ ۹۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی، سجاد مہدی حسینی، پروفیسر سید امیر حسن عابدی۔حیات و خدمات صفحہ ۲۱-۲۶۔[7]ماہنامہ ’’صبح نو‘‘ پٹنہ،شمارہ جنوری،فروری و مارچ ۱۹۶۵ء،صفحہ ۲۵۴-۲۵۵۔[8]ہمارا گاؤں،صفحہ ۵۱۔

[9] کچھ ہنسی نہیں ہے،صفحہ ۱۵۹-۱۶۰۔ [10]ہمارا گاؤں،صفحہ ۸۷۔[۲۶]باسی پھول ، صفحہ ۱۷۸-۱۷۹، افسانہ، آم کا پھل۔[11]’’صبح نو‘‘ صفحہ ۲۸۱۔’’میرا پسندیدہ افسانہ‘‘، تحریر علی عباس حسینی۔[12]باسی پھول، صفحہ ۲۸۔ افسانہ باسی پھول[۲۹]ماہنامہ ’’صبح نو‘‘ پٹنہ،صفحہ ۴۸ وصفحہ ۲۵۱،تحمینہ اختر۔’’علی عباس حسینی حیات اور خدمات‘‘ صفحہ ۱۳، ۱۴ رمظہر امام ’’آتی جاتی لہریں‘‘ صفحہ ۱۷۷۔[13]ماہنامہ کتاب،لکھنؤ،علی عباس حسینی خصوصی شمارہ۔ دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۶۸۔ ماہنامہ ’’صبح نو‘‘ ۱۲رشمارہ، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۵ء علی عباس حسینی نمبر صفحہ ۲۵۱۔(14)ماہنامہ ’’کتاب‘‘ لکھنؤ، علی عباس حسینی، صفحہ ۶۷۔[15]میلہ گھومنی، صفحہ ۱۷۷۔(15)ایضاً[16] تہمینہ اختر۔علی عباس حسینی حیات اور ادبی کارنامے۔صفحہ ۴۲۔[17]ممتاز حسین، ’’نقد حرف‘‘ صفحہ ۳۰۴، ماہنامہ ’’کتاب‘‘ لکھنؤ، ۷ر جولائی ۱۹۶۷ء۔صفحہ ۱۳،انٹرویواز پروفیسر عبدالعلیم احراری۔ترقی پسند تحریک خالص ادبی۔ عبد العلیم احراری۔تہمینہ اختر، علی عباس حسینی حیات اور ادبی کارنامے، صفحہ ۴۲۔[19]سالم قدوائی،علیم صاحب۔صفحہ ۱۰۶، ۳۲۹۔ ۳۴۳ ۴۴،مضمون از پروفیسر عبد العلیم احراری۔[20]میلہ گھومنی،صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸۔احتشام حسین و مسیح الزماں،انتخاب جوش،صفحہ ۱۷۶،نظم جنگل کی شہزادی میلہ گھومنی،صفحہ ۲۵۹۔ہمارا گاؤں،صفحہ ۲۰۶۔

(21) عزیز فاطمہ،اردو افسانہ،صفحہ ۷۳۔

☆☆☆

Urdu Ghazal ke badalte rujhanaat by Rohee Jan (research Scholar
Urdu ,Central University of Kashmir,Ganderbal) cell-9149997919
روحی جان (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل)

اردو غزل کے بدلتے رجحانات

غزل اردو ادب کی سب سے مقبول ، جاندار، اور پُرکشش صنف سخن ہے۔ اس صنف کے ابتدائی نقوش ہمیں عرب میں قصیدے کے جز تشبیب میں دکھائی دیتے ہیں، عرب شعراء قصیدے کے اس جز میں اپنے محبوب کا ذکر کرتے تھے، بعد میں یہ صنف عرب سے ایران پہنچی اور یہاں فارسی شعراء نے اس جز کو قصیدے سے الگ کر کے صنف غزل کی باقاعدہ بنیاد ڈالی اور یوں غزل کی صنف وجود میں آئی۔ فارسی سے یہ صنف اردو ادب میں پہنچی تو اردو شعراء نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے اپنے رنگ میں ڈھال کر ایک نئی پہچان عطا کی۔ غزل اصلاً داخلی صنفِ سخن ہے، اور اسی لیے عشق و محبت غزل کا غالب موضوع رہا ہے۔ لیکن یہ صنف نہ صرف جذبات و احساسات اور عشق و محبت کے بیان کا وسیلہ ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے فکری سماجی ، سیاسی ، معاشی ، معاشرتی اور نفسیاتی موضوعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس طرح غزل کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ اور آج بقولِ شاعر:

غزل میں ذات بھی ہے کائنات بھی　　　تمہاری بات بھی ہے ہماری بات بھی

غزل کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صنف عشق مجازی سے لے کر عشق حقیقی تک ، ذات سے کائنات تک، احتجاج سے جمالیات تک اور رومان سے روحانیت تک ہر فکری دھارے کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحت رکھتی ہے۔

اردو ادب میں غزل کا پہلا نمونہ شمالی ہند میں ملتا ہے۔اس ابتدائی مرحلے میں امیر خسرو کا نام اہمیت کا حامل ہے۔نمونہء کلام ملاحظہ ہوں:

زِحال مسکین مکن تغافل دِرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ درام اے جاں نہ لیو دکاہے لگائے چھتیاں

غزل کا با قاعدہ آغاز دکن کی سرزمین سے ہوا۔اور پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔صنفِ غزل مسلسل ارتقاء پزیر ہوتی رہی اور مختلف ادوار میں تہذیبی ،سماجی ،سیاسی اور فکری عوامل سے متاثر ہو کر مختلف تحریکات و رجحانات کا مظہر بنی۔ان ررجحانات اور تحریکات کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلے اردو غزل میں ہمیں تصوف کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ رجحان اردو غزل پر بہت عرصے تک حاوی رہا۔اردو غزل میں نیا رویہ اس وقت دیکھنے کو ملا جب ولی دکنی سدتا گلشن کے مشورے سے فارسی غزل کے مضامین سے استفادہ کرتے ہیں۔ولی نے فارسی مضامین کو غزل میں برتنے کی سعی کی تھی مگر موضوع اور اسلوب ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہوتے ہیں ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا ،مضامین کے ساتھ ساتھ فارسی اسالیب کا درآنا بھی لازمی تھا۔اس طرح ہمیں اس دور میں اردو غزل میں موضوعی اور اسلوبی سطح پر فارسی کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ولی کا دیوان جب شمالی ہند پہنچا تو وہاں کے شعراء نے ولی کی تقلید میں اردو غزل کو موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر نئی جلا بخشی۔ول ی نے شمالی ہند کی غزل کو جنوبی ہند سے ملانے کا کام انجام دیا۔اس طرح اردو غزل فارسی کے مد مقابل کھڑا ہو گئی۔شعرائے اردو نے غزل کو فارسی کے مدِ مقابل لانے کے لیے متعدد کوششیں کیں۔جن میں اولاً ایہام گوئی کی تحریک سامنے آئی۔اردو غزل میں یہ پہلی تحریک تھی جس نے غزل کو موضوع اور زبان و بیان کے حوالے سے متاثر کیا۔ اردو ایہام گوئی کا نقطہ آغاز ولی کو قرار دیا جاتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید یوں رقم طراز ہیں:

"تاہم ولی کے ہاں چونکہ ایہام کیا ولین نقوش واضع اور فطری انداز میں ملتے ہیں اس لیے ولی کو ہی ایہام کے تحریک کا نقطہ آغاز قرار دینا مناسب ہے"
(اردو ادب کی تحریکیں۔ڈاکٹر انور سدید، ص190)

اس دور میں جن شعراء نے غزل کی لفظیات کو ایہام گوئی کا سہرا پہنایا ان میں خان آرزو، آبرو، شاکر ناجی ، یک رنگ ، مضمون اور حاتم کا شمار ہوتا۔ ہیں۔ اردو غزل کو جہاں اس تحریک سے فائدہ پہنچا وہ اس کے منفی اثرات سے بھی غزل کو دو چار ہونا پڑا۔اس سے اردوغزل کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔اس کے استعمال نے اردوغزل کو غیر فطری بنا دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف ایک نئی تحریک نے جنم لیا جس کو اصلاح زبان کی تحریک کینام سے جانا جاتا ہے۔ایہام گوئی کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں مظہر جانِ جاناں کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے ایہام گوئی کو غزل کے لیے مضر قرار دیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہے:

"اس تحریک کے خلاف اولیں ردعمل میرزا مظہر جان جاناں نے ظاہر کیا اور نہ صرف اردوئے معلّی کو نئی شاعری کی زبان بنا دیا بلکہ ولی کے اثرات کو بھی کم کرنے کی کاوش کی۔ اس دور میں اردو کے اصول وقواعد مقرر کیے گئے۔عربی اور فارسی کے کثیر الاستعمال الفاظ کو جائز اور ہندی بھاشا کے الفاظ اور فارسی حرف وفعل کے مروّجہ استعمال کو متروک قرار دیا گیا"(اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص134)

غزل کا کلاسکی دور بہت ہی ترقی یافتہ ہے۔اس کا آغاز آٹھارویں صدی میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں سے ہوتا ہے۔دہلی میں سودا اور درد جبکہ لکھنؤ میں مصحفی ، انشا، رنگین ،، جراءت اور آتش وناسخ وغیرہ جیسے شعراء نے اس صنف کو عروج بخشا۔اس دور میں اردوغزل پر فارسی کا گہرا اثر رہا۔شعری جمالیات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کلاسکی غزل کے بنیادی موضوعات عشق مجازی وحقیقی ،فراق و وصال ، انتظار، محبوب کی بے وفائی نیز تصوف وعرفان ، تقدیر اور دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ رہے ہیں۔اس دور کی

غزل کی زبان میں سادگی کے علاوہ فارسی تراکیب، الفاظ کی کثرت، استعارہ، کنایہ، رمزو علامت کا برملا استعمال، نرمی، موسیقیت اور زبان کی لطافت، رعایت لفظی وغیرہ جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میر، سودا اور درد کا دور اردو غزل کا عہدِ زریں کہلاتا ہے۔ اس دور میں میر نے اردو غزل کو جو وقار بخشا اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ اسی طرح بعد آنے والے شعراء میں غالب، مومن اور ذوق نے اردو غزل کی شمع کو مذید روشن کیا۔ غالب نے غزل کو پہلی بار غور وفکر کی صلاحیت دی، استفہامیہ لب ولہجہ عطا کیا اور غزل کو فلسفیانہ موضوعات سے ممیز کیا۔ نمونہ کلام:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اس کے بعد اردو غزل میں ایک اہم رویہ اس وقت شروع ہوا جب 1857 کا ہنگامہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ہی علی گڑھ تحریک نے جنم لیا اور اردو ادب کی ہر صنف کو اس تحریک نے متاثر کیا۔ اس دور میں ہر دل عزیز صنفِ غزل پہلی بار تنقید کا نشانہ بنی۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب میں حالی کے ہاتھوں اردو تنقید کی بنیاد پڑی۔ حالی نے "مقدمہ شعروشاعری" میں غزل پر اپنے اعتراضات کو سامنے رکھا۔ انہوں نے مقدمہ میں غزل کو تنقید کا نشانہ بنانا۔ انہوں نے تخّیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیا۔ اور سادگی، جوش، اصلیت کو شعر کی خوبی ٹھہرائی۔ اس حوالے سے خالد علوی لکھتے ہیں:

"حالی اور آزاد کی کوششوں سے نئے ادبی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ حالی غزل کی جادوئی کیفیات، رمزو ایجاز سے ہمیشہ متاثر رہے۔ لیکن مروجہ غزل کی یکسانیت سے تنگ ہو کر غزل دشمنی پر آمادہ ہو گئے۔ وہ غزل کو روایتی اور رسمی عناصر سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ جہاں حقیقی واقعات کا عکس واضع نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ حالی کی غزل سے زیادہ ان کے مقدمیشعر وشاعری کا اثر ہوا۔ مقدمہ نے اردو تنقید اور اردو شاعری کی دنیا بدل دی" (غزل کے جدید رجحانات، خالد علوی، ص 10)

حالی اور آزاد کی مسلسل کوششوں نیاردو ادب کو نیچرل شاعری سے متعارف کرایا۔ غرض سرسید تحریک نے اردوغزل کی اصلاح میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔اس تعلق سے خالدعلوی آگے لکھتے ہے:" سرسیداور حالی نے نئی غزل کی تنقید کواس درجہ پر پہنچایا تھا کہ شاعری کا نیچرل ہونااہم وصف قرار پایا"(ایضاً،ص16)

ان کے علاوہ جن شعراء نے غزل پر اعتراضات کیے ان میں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر کلیم الدین احمد،شبلی نعمانی،مولاناوحیدالدین سلیم اورعمت ءخان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔غزل کا یہ اعتراضات والا دور بھی بہت جلد گزر گیا اور غزل مخالف آوازوں کے باوجوداس کی مرکزیت ختم نہ ہوسکی۔غزل میں ایک نیا رجحان ہمیں اقبال کی غزلوں میں ملتا ہے۔غالب کے بعداقبال ہی وہ واحد شاعر دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے لفظ کو نئے اسالیب عطا کیے اور موضوع کومقصود بالذات بنانے کے باوجودفن کے جمالیاتی پہلوکومجروح نہیں ہونے دیا۔

اردوادب میں ایک اورتحریک رومانوی تحریک کے نام سے ابھری۔ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔اس تحریک نے اردو ادب کی ہرصنف کومتاثر کیا اور اردوغزل بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اردوشاعری کا جائزہ لیاجائے تو ابتدا سے ہی اس میں ہمیں رومانیت کا پہلونظر آتا ہے۔ یہ پہلواردوشاعری کا خاصا ہے۔لیکن بقول ڈاکٹرانورسدید" تاہم ابتدامیں یہ عناصر بڑی حدتک بکھرے ہوئے تھےاورکسی ایسے منظم طرزِ احساس سے نہیں پھوٹے تھے جوشاعر کی شخصیت کاجزوبن چکاہو"(اردوادب کی تحریکیں،ڈاکٹرانورسدید،ص434)۔

اس تحریک نے جذبہ کی انتہاپسندی کوفروغ دیا۔اس تحریک سے وابستہ غزل گو شعراء میں فراق گورکھپوری،اقبال،،اختر شیرانی،حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی وغیرہ نے غزل کو بام عروج تک پہنچانے میں نمایاں کارنامہ سرانجام دیا۔جدیدغزل کا دور شروع ہواتو فانی بدایونی،حسرت موہانی،اصغرگونڈوی،اورجگرمرادآبادی نے اردوغزل

کوئی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔ان شعراء نے غزل میں محبوب کے روایتی تصور کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ان کے محبوب کی صورت ایک جیتی جاگتی ، گوشت پوست کی حقیقی عورت تھی ، جو صرف حسن کی علامت نہیں بلکہ احساسات اور جذبات کی حامل بھی تھی۔ان شاعروں نے انسان کے وجودی مسائل،حیات ومقاصد حیات سے تعلق رکھنے والے سوالات پر غور وفکر کیا اور غزل کو اپنے مکاشفات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا (اصغر)
حاصل علم بشر جہل کا عرفان ہونا عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا (فانی)
اور تو مرے ہجر میں کیا رکھا ہے اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے (حسرت)

1936 میں اردو ادب میں ایک جاندار تحریک سامنے آئی جسے ترقی پسند تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس تحریک نے ہر صنف ادب کو متاثر کیا۔شروع میں اس تحریک نے غزل پر بے اعتنائی برتی مگر بہت جلد غزل جیسی داخلی صنف سخن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔غزل کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر ترقی پسند شعراء نے یہ محسوس کیا کہ یہ صنف ہمارے مقصد کے لیے کارآمد ہے۔ترقی پسند غزل نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا اور غزل کو روایتی موضوعات سے نکال کر سماجی ، سیاسی ، معاشی اور معاشرتی شعور کا حصہ بنادیا۔غزل کو عوام سے قریب تر لانے کی کوشش کی گئی۔غزل میں انقلابی مقاصد، حقیقت نگاری ، عوامی مسائل ، محنت کش طبقے کی حمایت ، سماجی استحصال ، مادے کی حقیقت ، جاگیردارانہ نظام کی نفی ، جدو جہد ، تحریک آزادی وغیرہ جیسے موضاعات پیش کئے گئے۔ان موضوعات کو برتنے کے لیے ایک نئی زبان اور اسلوب کا استعمال ہوا۔ان شعراء نے روایتی استعاروں اور علامات کو نئے معنوں کے ساتھ برتا۔بقولِ ڈاکٹر انور سدید: " ترقی پسند شاعری میں زندگی کے خارج کو موضوع بنانے اور قاری کو براہِ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔اس تحریک نے زندگی کی جبریت کو طنز کا

نشانہ بنایا اور شاعر کو اس کے خلاف اونچی آواز میں احتجاج کرنے کی دعوت دی، نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی اقدار کے خلاف ردِعمل کا جذبہ پیدا ہوا اور معنوی طور پر اشتراکی حقیقت نگاری کو ادب کی اصلی نہج قرار دے دیا گیا" (ایضاً ص536)

ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی اور ادیبوں پر جب یہ دباؤ بڑھا کہ وہ صرف سماجی مسائل اور نظریاتی خیالات کو ہی اپنے فن میں جگہ دیں تو بعض شعراء نے اس تحریک سے کنارہ کیا۔ ترقی پسند شعراء میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، کیفی عظمی، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور رجحان سامنے آیا جو حلقہ اربابِ ذوق کے نام سے مشہور ہے۔ اس رجحان نے غزل جیسی نازک صنف سخن کو محض سیاسی نظریے سے وابستہ نہ رہنے دیا بلکہ انسانی احساسات، جذبات اور تجربات کے فنکارانہ اظہار کا مظہر بنایا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حلقہ ارباب ذوق کی غزل اردو غزل کی داخلی تبدیلی کا دور تھا۔ اس سے وابستہ شعراء میں ن۔م راشد، میراجی، تابش صدیقی، ریاض مجید، عظیم قریشی، یوسف ظفر اور قیوم نظر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

1955 سے اردو غزل میں ایک اور رجحان سامنے آیا جس کو جدیدیت کا نام دیا گیا۔ یہ رجحان اردو ادب میں کافی زیادہ موثر ثابت ہوا۔ جدیدیت کا رجحان ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر ابھرا۔ اس رجحان نے ترقی پسندی کی نفی کی اور سماج سے زیادہ فرد اور اس کی داخلی کیفیات کو مقدم ٹھہرایا۔ اس رجحان سے فنی وفکری سطح پر ہر صنف میں نت نئے تجربات دیکھنے کو ملے، خصوصاً زبان کے تجربے دیکھنے کو ملے۔ جدید غزل گو شعراء نے تنہائی، خوف کا احساس، بے چینی، بے چہرگی، داخلیت، اجنبیت، بے گانگی، عرفان ذات جیسے موضوعات کو غزل میں پیش کیا۔ انفرادیت پر جدیدیت نے بہت زیادہ زور دیا۔ فرد کی اہمیت اس کے نزدیک بے حد اہم تھی۔ زبان واسلوب کے حوالے سے نئے تجربات ہوئے۔ یہ پہلا رجحان تھا جس میں غزل کی ہیت میں تبدیل دیکھنے کو

ملیاور" آزادغزل" وغیرہ کا چلن ہوا جو زیادہ دیر نہ چل سکھا۔اس طرح غزل میں کافی تبدیلی دیکھنے کو ملی۔جدید غزل گوشعراء نے نئی تراکیب کے علاوہ اجنبی علامتی اظہار کو ترجع دی۔اساطیروں کا استعمال کیا گیا، روایتی استعاروں، تلمیجوں اور اشاروں سے گریز کیا گیا۔غزل میں جدیدیت کے حوالے سے سب سے پہلا نام ناصر کاظمی کا آتا ہے۔ان کی غزلوں میں داخلیت کا بھرپور احساس ملتا ہے۔عشقیہ موضوعات کو بھی بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا　　جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

یہ تمنا نہیں اب داد ہنر دے کوئی　　آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

جدیدیت کے دیگر شعراء جنہوں نے اس رجحان کے زیر اثر غزلیں لکھیں جن میں ناصر کاظمی، ندافاضلی، خلیل الرحمٰن عظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، احمد مشتاق، شہریار، بشیر بدر، منیر نیازی، امجد اسلام امجد، پروین شاک ر، احمد فراز، مظفر حنفی، اور افتخار جالب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔1980 کے بعد مابعد جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔اس رجحان کا اثر اردو غزل پر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔مابعد جدیدیت دراصل کشادہ ذہنی رویہ ہے جس کا زور ثقافت اور اس کی بازگشت پر ہے۔جدیدیت نے فرد کی ذات اور اس کی داخلی کیفیت کو ہی مرکزیت دی تھی لیکن مابعد جدیدیت نے اس نرعیے کو رد کرتے ہوئے لامرکزیت پر زور دیا۔بقول گوپی چند نارنگ:

"مابعد جدیدیت نہ ترقی پسندی کی ضد ہے نہ جدیدیت کی ،اور چونکہ یہ نظریوں کی ادعائیت کو رد کرنے اور طرفوں کو کھولنے والا رویہ ہے، اس کی کوئی بندھی ٹکی فارمولائی تعریف ممکن نہیں ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت ایک کھلا ڈلا ذہنی رویہ ہے تخلیقی آزادی کا، اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار کرنے کا، معنی کو سکہ بند تعریفوں سے آزاد کرنے کا، مسلمات کے بارے میں از سرنو غور کرنے اور سوال اٹھانے کا، دی ہوئی ادبی لیک کے جبر کو توڑنے کا "("مابعد جدیدیت اردو تناظر میں" مشمولہ، ترقی پسندی

جدیدیت مابعد جدیدیت، گوپی چند نارنگ،ص۔610-609)

جو رشتہ جدیدیت نے سماج سے توڑ دیا تھا مابعد جدیدیت نے ایک بار پھر سے انسانی وجود کا رشتہ سماج، تہذیب وثقافت سے جوڑ دیا۔غزل میں دیومالائی اور اساطیری عناصر دیکھنے کو ملے، بین المتونیت کے ذریعے روایتی غزل کی ازسرنوتفہیم ہوئی جس سے غزل کا دامن وسیع ہوتا گیا۔مابعد جدید غزلوں میں ثقافت کی بازیافت،تہذیبی تحفظ،معنی کی تکثیریت، معاشرتی زوال، جدید ٹیکنالوجی، سیاسی بہران، مقامیت، بے اطمنانی، انسان دوستی، سائنسی ایجادات کے تجرباتی نتائج کی ترجمانی ملتی ہیں۔ یہاں سادہ بیانی کو ترجع دی گئی، پرانی تشبیہات، استعارات اور تراکیب میں نیا پن دیکھنے کو ملا۔ مابعد جدیدیت میں تانیثیت کا رجحان زور پکڑنے لگا۔اگر چہ اردو غزل میں اس سے پہلے بھی نسائی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا مرد شعراء کی غزلوں میں عورت کا تصور شروع سے رہا، لیکن وہاں عورت کو صرف حسن وعشق تک محدود رکھا گیا۔اگر چہ ترقی پسند تحریک سے ہی عورت کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی صلاحیتوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا تھا تاہم مابعد جدید دور میں خواتین شعراء نے غزلوں میں شدت سے اپنی نفسیات، مرد اساس معاشرے میں عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور اپنے حقوق کے لیے احتجاج کی آواز کو بلند کیا۔ مابعد جدیدیت سے وابستہ شعراء میں اسعد بدایونی، فرحت احساس، جاوید قمر، قاسم امام، عشرت ظفر، طارق قمر، اسلم محمود، شجاع خاور، راشد آزر، اظہار اثر، شارق کیفی، سادقہ نواب سحر، عزرا پروین، کشور ناہید، زہرا نگاہ، عالم خورشید، مہتاب حیدر نقوی، سراج اجملی، سلیم انصاری، منوررانا، راحت اندوری اور عارف امام وغیرہ نے غزل کی روایت کو ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کیا۔نمونہ کلام:

ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سا بنا بیٹھا ہوں
نہ یہ مٹی نہ یہ پانی نہ ہوا میری ہے (فرحت احساس)

شمع کشتہ کی طرح جی لیجے دم گھٹے بھی تو گلہ کیا کرنا (کشور ناہید)

ایک آنسو بھی حکومت کے لیے خطرہ ہے
تم نے دیکھا نہیں آنکھوں کا سمندر ہونا (منور رانا)

دکانیں شہر میں ساری نئی ہیں ہمیں سب کچھ پرانا چاہیے تھا (شجاع خاور)

آج سائنس اور میڈیا کی ترقی نے دنیا کو گلوبل ولیج بنا دیا ہے۔ اور سماج کو تیز رفتار تغیر سے دو چار کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے برق رفتاری سے زندگی کے مسائل تبدیل ہو رہے ہیں اور اس کا ادراک مختلف غزل گو شعراء کے یہاں ملتا ہیں۔ دور حاضر میں زندگی تناؤ کا شکار ہو چکی ہے۔ مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح پر امن و سکون اور زندگی کی بقا و بحالی کے لئے جتن کیے جا رہے ہیں۔ عصر حاضر کی غزل انسانی زندگی کے سب پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ آج غزل کئی معنوں میں مختلف ہے جس میں ندرت، تازگی و توانائی موجود ہے۔ عصر حاضر کا شاعر اپنے زمانے کے مسائل اور پیچیدگیوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ وہ سائنس و ٹکنالوجی کی تیز رفتاری، صارفیت کی یلغار، سیاست، گلوبلیزیشن، تشدد و فرقہ واریت، میڈیا کی حکمت عملی، نئی نسل میں بڑھتا ہوا فرسٹریشن، استحصال، جنگی حالات، غربت، بے روزگاری، ناانصافی، وجودی شناخت، دہشت گردی، طبقاتی تقسیم، تنہائی، عدم تحفظ، نفسیاتی بیماری، ذہنی کشمکش، آرٹی فیشیل انٹیلی جنس اور عوام میں بڑھتی ہوئی مایوسی جیسے موضوعات کا شعور رکھتا ہے اور ان موضوعات کا فنکارانہ اظہار بھی بہ خوبی کرتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ دور کی غزل کی منفرد بات یہ ہے کہ آج غزل میں مشکل اور دقیق فارسی عربی الفاظ و تراکیب کی جگہ روزمرہ کی زبان نے لے لی ہے۔ جس میں نئے الفاظ اور عام اشیاء سے نئی استعاروں اور علامات کو تراشنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان کے الفاظ کا خاصا استعمال ہو رہا ہے۔ غرض عصر حاضر کا شاعر مقامی سطح سے نکل کے عالمی سطح پر پھیلی تہذیبی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کو موضوع بحث بنا رہا ہے۔ نمونے کے طور پر عصر حاضر کی غزل سے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

خاک کو ذوق نمو بھی چاہیے قطرہ بھر تن میں لہو بھی چاہیے (روشنؔ لال روشنؔ)

منزل پر پہنچ کر یہ ہم نے جانا رستہ تو ٹھوکر سے نکلتا ہے (نعیم اختر جراءت)

مختصر سی زندگی میں کتنی نادانی کرے
ان نظاروں کو کوئی دیکھے کہ حیرانی کرے (مہتاب حیدر مقوی)

سنو یہاں کوئی مسئلہ ہے تمہاری آواز کٹ رہی ہے (تہذیب حافی)

اس طرح بقول شاعر یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

ولی کے گھر سے نکل کر رواں دواں ہے غزل
قسم خدا کی ابھی تک تو نوجواں ہے غزل

☆☆☆

Waris Allvi ka Tanqidi ravaiya aur firaq Gorakhpuri ki Nazm Nigari by

Asif Jamal (R. Scholar, Dept. of Urdu , BHU ,Varanasi) 6392290028

آصف جمال (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

وارث علوی کا تنقیدی رویہ اور فراق گورکھپوری کی نظم نگاری

فراق گورکھپوری کی شاعری مختلف اصناف سخن کو محیط ہے لیکن ان کی شہرت ان کی غزلوں سے قائم ہے۔ان کی ناموری میں ان کی رباعیات بھی اپنا حصہ ادا کرتی رہی ہیں اوران دونوں اصناف کا تذکرہ فراق تنقید میں بار بار ہوتا رہا ہے۔لیکن فراق کی نظم نگاری سے اغماض اورصرف نظر کا رویہ فراق تنقید کا عمومی رجحان رہا ہے۔فراق جس زمانے میں شاعری کررہے تھے وہ زمانہ غزل کے لیے کتنا سازگار تھا یہ ہم سبھی جانتے ہیں لیکن اس عہد کو اردو نظم میں جن انقلابی تبدیلیوں کے لیے یاد کیا جاتا ہے اس میں فراق کا بھی حصہ ہے۔میرا موضوع فراق کی نظم نگاری نہیں بلکہ وارث علوی کی ایک تحریر کا محاکمہ ہے جو انھوں نے فراق کی نظم نگاری سے متعلق تحریر کیا ہے۔اس مضمون میں وارث علوی نے فراق کو ایک الگ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں فراق اپنی غزلوں سمیت ایک نئی اور قدرے منفرد شخصیت کی صورت میں نظر آتے ہیں۔وارث علوی کا شمار اردو فکشن کے ناقدین میں ہوتا ہے مگر انھوں نے مختلف شعرا کو بھی اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔فکشن تنقید کے سلسلے میں ان کے تنقیدی نظریات، مباحث، اور تجزیے کسی بھی تعریف کے محتاج نہیں ہے تاہم فکشن اور نظم کے بنیادی خدوخال اور تنقیدی طریقوں میں جو فرق ہے وہ ان سے بھی باخبر تھے اس لحاظ سے مختلف شعرا پر ان کے تنقیدی محاکمے کسی معرکے سے کم نہیں ہیں۔اردو شعرا کی تخلیقات اور شخصیات پر ان کی

تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ شاعری بالخصوص نظم کا ایک منفرد تصور رکھتے تھے اور نظموں کے مطالعے میں ان کا یہ تصور جو کہ مغربی شاعری سے مستعار ہے واضح طور پر نظر آتا ہے۔

وارث علوی نے جن مخصوص شعرا کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا فراق گورکھپوری ان میں ایک اہم نام ہے۔ وارث علوی فراق گورکھپوری کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو اردو کے بڑے نظم گو شعرا کی فہرست میں جگہ دیتے ہیں۔ وارث علوی کے نزدیک اقبال کے بعد اردو نظم نگاری کے باب میں جن چند شعرا کا نام اہمیت کا حامل ہے ان میں جوش اور فراق خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ وارث علوی نے فراق کی نمایاں اور بہترین نظموں کا فکری وفنی جائزہ لیا ہے اور ان کی ایسی بصیرت افروز تشریح وتوضیح کی ہے فکر کے تمام دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ خاص طور سے پرچھائیاں، آدھی رات، جگنو پر ایسے انداز میں لکھا ہے کہ نظم پوری آب وتاب کے ساتھ ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔

فراق کی ایک نظم ''نغمۂ حقیقت'' ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ نظم ہے اور فراق کی قادر الکلامی کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن قادر الکلامی ہی اس کا سب سے بڑا عیب بھی ہے۔ کیونکہ اس کے سبب تخیل اپنا بنیادی کام یعنی حقائق ومشاہدات کو لفظی پیکروں میں بدلنے کا کام ٹھیک سے نہیں کرتا ہے۔ وارث علوی کا خیال ہے کہ یہ نظم ایک یا دو بار پڑھنے میں ہی اچھی لگتی ہے۔ 'شام عیادت ،حسن کی دیوی' فراق گورکھپوری کی سنگھار رس کی نظمیں ہیں۔ محبوب کے خدوخال کے حسن اور سراپا نگاری کو غزل اور مثنوی کے ملے جلے فارم میں بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ وارث علوی ان نقادوں میں سے ہیں جو فنکار کو ہیئت اور اسلوب کی جکڑ بندیوں سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ان نظموں کا لطف ہیئت کی پابندی میں نہیں بلکہ اشعار کی بہتی ہوئی رنگین موجوں میں ہے۔ ان نظموں میں لفظوں کا آہنگ ،استعاروں اور تشبیہوں کا حسن ،لب ولہجہ کی نشاط

آہنگ سرشاری اور جذبات واحساسات کا والہانہ پن ذہن کو مسحور کرتے ہیں اور اسی سحر زدہ دھندلکے میں محبوب کی آنکھ، زلف، رخسار اور رسمساتا کسمساتا بدن اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔'' اے

وارث علوی کے نزدیک اردو نظم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہماری نظمیں غزل زدگی سے کبھی بھی پورے طور پر آزاد نہ ہو سکی ہیں۔غزل کے مروجہ اصولوں کی پاسداری ، ایک ہی خیال کی تکرار اور ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی کوشش، جس پر ہماری غزل کے ایک بڑے سرمایہ کا انحصار ہے اس چیز سے ہماری نظمیں بھی خود کو نہیں بچا سکی ہیں۔فراق گورکھپوری بھی غزل زدگی کی اس مشرقی روایت کا شکار ہو گئے جس کی وجہ سے فراق گورکھپوری کی شناخت بطور نظم نگار کے اردو دنیا میں اس طرح مستحکم نہ ہو سکی جس طرح بحیثیت غزل گو ان کو مقبولیت اور پذیرائی ملی۔آپ بیتی کو جو جگ بیتی بنا کر پیش کرنا کسی بھی فنکار کے فن کی معراج ہے۔زندگی میں ہم بہت سارے مسائل اور حوادث و تجربات سے نبرد آزما ہوتے ہیں مگر ہماری زندگی کے تمام تجربات تخیلی تجربات نہیں بن پاتے ہیں۔آپ بیتی کو تخیل کی چادر میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرنا کہ وہ آفاقی اور ہمہ گیر تجربہ بن جائے یہ آسان کام نہیں ہے۔فراق گورکھپوری کے یہاں بھی اپنی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کا جا بجا بیان تذکرے کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتا ہے۔فراق گورکھپوری کی طویل نظم ''ہنڈولا'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے وارث علوی محسوس کرتے ہیں کہ یہ نظم خودنوشت کا رنگ لیے ہونے کے باجود ایک کامیاب نظم ہے۔ وہ نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہنڈولا میں ایسی روانی اور بے ساختگی ہے،نظم کی آوارہ خرامی میں بھی ایسا رچاؤ ہے کہ قاری ایک محویت کے عالم میں اسے پڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی دلچسپی کبھی ماند نہیں پڑتی۔طویل ندی میں بڑی ندی کے مانند بہت سا جھاڑ جھنکار بھی تیز بہاؤ میں بہہ جاتا ہے۔جب کہ مختصر غنائی نظم میں اس کا ایک تنکا بھی پڑ جائے تو نظم کا رنگ و آہنگ سب تباہ

ہو جائے۔ اور جب ہنڈولا میں فراق کا خلاق تخیل فطرت پر لفظوں کی کمند پھینکتا ہے تو ذہن کے آفاق معجزۂ فن کی نمود سے منور ہو جاتے ہیں۔'' ۳؎

جب بھی فراق کی نظموں کی بات ہوتی ہے تو ''پرچھائیاں'' اور ''آدھی رات'' کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ فراق کی یہ انتہائی مشہور و مقبول نظمیں ہیں۔ وارث علوی اسے فراق کی ہی نہیں بلکہ اردو کی چند مشہور اور کامیاب نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ طویل نظموں میں غنائیت اور آہنگ کو برقرار رکھنا ایک بڑا تخلیقی کارنامہ ہے۔ فطری احساس کو شعری قالب میں پروکر اس طرح بیان کرنا کہ نظم جذبات واحساسات کا خوبصورت مرقع اور نگار خانہ بن جائے یہ شاعر کے تخلیقی تجربے کی معراج ہے۔ موسیقت کا جادو جگانے کے باوجود فراق کی یہ نظمیں بصری پیکروں کے حسن سے سمجھوتا نہیں کرتی ہیں۔ وارث علوی لکھتے ہیں کہ:

''وہ غنائی نظم جو سنگیت کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اسے ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ ہوش ربا نغمگی نظم کے معنیاتی نظام پر حاوی ہو جائے کہ ٹھوس لفظی پیکر تک اپنا رنگ اور اپنے نقوش آہنگ کی طلسمی لہروں میں تحلیل کر دیں۔'' ۴؎

نظم ''آدھی رات'' میں رات کی مختلف کیفیات کا بیان اتنے سادہ اور دلکش اسلوب میں بیان ہوا ہے کہ ذہن میں رات کی موہوم اور کہیں کہیں بالکل صاف تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ نظم میں دوسری جنگ عظیم اور انقلاب کی آمد کا بیان اتنی لطافت سے بیان ہوا ہے کہ جنگ، افلاس، غربت اور انقلاب وغیرہ کا بیان رات کے خمار اور رات کی مدہوشی کے آگے معمولی اور غیر اہم نظر آتا ہے۔ اور رات کے متعلق شاعر کے شعور کا محض ایک حصہ بن کر ابھرتے ہیں۔ نظم کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہاں زمینی واقعات کا بیان سیدھے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ شاعر کے شعور کا ایک حصہ بن کر ابھرتے ہیں جس کی وجہ سے نظم محض رات کی کیفیات بننے کے بجائے رات سے انسانی اور زمینی رشتے کو قائم رکھتی ہے۔ وارث علوی اسی ارضی اور انسانی رشتے کے متعلق نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعرانہ تخیل جتنا ارضی ہوتا ہے اتنا ہی افلاکی اور ماورائی بھی ہوتا ہے۔ تخیل کی بھٹی میں خیال ،احساس، مشاہدہ اور تجربہ ہر چیز بکھر کر ایک صورت اختیار کرتی ہے جو اپنی مکمل ترین شکل میں موضوع اور ہیئت ،احساس اور اظہار کی ثنویت ختم کرتی دیتی ہے۔ 'آدھی رات' میں وہ لخت لخت خیالات جو جنگ، افلاس اور انقلاب سے متعلق ہیں نظم کے آخری تین حصوں میں ایک تصور میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن رات یہاں اپنی ازلی صفات ،اپنی سریت اور سحر انگیزی کو قائم رکھتے ہوئے ایک ایسی علامت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں تصورات جذب ہو جاتے ہیں۔اس طرح نظم کا خواب ناک آہنگ اور وہ طرز سخن جورات کا جادو جگاتا ہے آخر تک برقرار رہتا ہے۔'' ۵ ؎

نظم 'پرچھائیاں' بھی 'آدھی رات' کی طرح شام ، رات، مناظر فطرت کے حسن کے بیان پر لکھی گئی ایک خوبصورت نظم ہے۔ سرسری طور پر دیکھنے میں 'پرچھائیاں' خالص رومانی نظم نظر آتی ہے جس میں تیسرے بند سے محبوب کے سراپے کا بیان شروع ہوتا ہے لیکن اس کے باجود دونوں نظموں کا موضوع بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں عاشقانہ نظمیں بھی کہا جا سکتا ہے۔اس نظم میں فطرت، شاعر محبوب اور وقت گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں ۔بعض جگہوں پر محسوس ہوتا ہے کہ فطرت اور محبوب میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔وارث علوی اس نظم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''مناظر فطرت کی خوبصورت اور منفرد عکاسی کے درمیان حسن و شباب سے لبریز محبوب کا جسم اور سراپا ابھرتا ہے۔لیکن اس کے بیان میں بھی عناصر فطرت کا بطور استعارہ اور تشبیہ کے ایسا التزام ہے کہ نظم میں فطرت پس منظر ہی نہیں بلکہ ایک ایسا عنصر بن جاتی ہے جسے بدن سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔یعنی یہ کہنا مشکل ہے کہ فطرت کہاں ختم ہوتی ہے اور انسان کہاں شروع ہوتا ہے۔'' ٦ ؎

فراق گورکھپوری کی نظم 'جگنو' ماں پر لکھی گئی ایک کامیاب نظم ہے۔ 'جگنو کا' مطالعہ غیر شعوری طور پر ہمارے ذہن کو اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کی یاد دلاتا

ہے۔اقبال اور فراق دونوں کی نظم اپنے موضوع، اسلوب اور آہنگ کی وجہ سے اپنے طرز کی منفرد نظمیں ہیں۔اقبال کے فارسی زدہ اسلوب اور آہنگ کے سامنے فراق کی ٹھیٹھ ہندوستانی لب و لہجے میں لکھی گئی نظم ذرا مسکین سی نظر آتی ہے۔وارث علوی کا خیال ہے کہ فراق کی نظم 'جگنو' ان معنوں میں منفرد ہے کہ یہ نظم اپنی سادگی کے باوجود پرکاری ،پیچیدگی اور گہرائی اور گیرائی کی بہترین مثال ہے جب کہ اقبال کی نظم سے اگر فلسفہ کو الگ کر دیا جائے تو ان کی نظم میں کچھ خاص حسن باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

وارث علوی کے تنقیدی مضامین میں جابجا اقبال کی شاعری پر گہری تنقید دیکھنے کو ملتی ہے۔کلیم الدین احمد کی طرح وارث علوی کو بھی اقبال کی پیغامبری سے شکایت ہے۔مگر ساتھ ہی وارث علوی اقبال کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں اور جہاں وہ فراق کی نظم 'جگنو' کی تعریف کرتے ہوئے اسے اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' پر فوقیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اقبال فراق سے بہت بڑے شاعر ہیں اور یہ عظمت محض اقبال کے کلام میں فلسفے کی موجودگی کے سبب نہیں ہے بلکہ اقبال کا تخیل بھی زیادہ پختہ اور گہرا تھا اور اقبال کے یہاں اچھی نظموں کا سرمایہ فراق کے مقابلے میں زیادہ ہے۔وہ 'جگنو' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان باتوں سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کے یہاں فلسفہ ہی فلسفہ ہے شاعرانہ تخیل نہیں، یا یہ کہ فراق اقبال جتنے ہی بڑے شاعر ہیں۔ایسی باتیں اتنی ہی احمقانہ ہیں کہ جتنی کہ اقبال پرستوں کی باتیں جو فراق اور جوش کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔اقبال فراق سے بڑے ہیں،، بہت بڑے ہیں کیونکہ اقبال کے پاس اچھی اور بڑی نظموں کا بہت بڑا سرمایہ ہے جب کی فراق کے یہاں گنتی کی دو چار نظمیں ہیں۔لیکن یہ نظمیں بھی بڑی نظمیں ہیں، کیونکہ ان میں شاعرانہ احساس اور تخیل کی کارفرمائیاں جولانگاہ میں ہے جو شاعری کی اپنی ہے۔یہاں تخیل ہی اسرار حیات کو منکشف کرتا ہے وہاں تک فلسفہ کی رسائی نہیں۔'' ۶

’جگنو‘ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یہ نظم ایک ایسے بیس برس کے نوجوان کے جذبات کا اظہار ہے جس نے اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اپنے ماں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ ماں کی شفقت کے بغیر اس بچے کا بچپن کتنی صعوبتوں اور محرومیوں میں گزرا، نظم اس کی خوبصورت تصویر ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وارث علوی نے فراق کی نظموں کو جس نظر سے دیکھا ہے اس طرف نگاہ کم جاتی ہے۔ فراق کے سلسلے میں ان کا یہ خیال درست ہے کہ مغربی شعر و ادب سے انھوں نے بہت استفادہ کیا ہے مگر اردو کی غزل زدگی سے وہ اپنی نظموں کا دامن نہیں بچا سکے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ فراق کی کچھ نظمیں مثلاً ’آدھی رات‘، پرچھائیاں، جگنو‘ وغیرہ اس غزل زدگی سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔ اردو کی نظمیہ شاعری میں فراق کی یہ بہترین نظمیں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ وارث علوی ،نظم گو فراق ،مشمولہ ’’فراق گورکھپوری ذات و صفات‘‘، مرتبہ: مخمور سعیدی، دہلی اردو اکادمی۔ ۱۹۹۸۔ ص: ۶۱، ۶۲

۲۔ ایضاً ص: ۶۳، ۶۴

۳۔ ایضاً ص: ۶۴

۴ ایضاً ص: ۶۸

۵ ایضاً ص: ۷۲

۶۔ ایضاً ص: ۷۴

☆☆☆

The Indo-Aryan languages and the linguistic Position of Pashto in relation to Sanskrit by Mahmood Marhoon (Research Scholar dept. of Persian, Jamia Millia Islamia, New Delhi)

محمود مرہون (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، نئی دہلی)

زبانہای ہندو آریایی وجایگاہ پشتو وسانسکریت در آن

خلاصہ:

در این تحقیق کوتاہ نظریات مستشرقین راجع بہ زبان پشتو کہ یکی از کہن ترین زبانہای ہندآریایی است (وگویندہ گان آن درآریانا مرکزی (افغانستان)، ہند، ایران وافغانستان و ہندوستان محکوم (پاکستان) زندگی می کند) زیری مطالعہ قرار گرفتہ شدہ است۔ در این تحقیق مطالعہ گردیدہ کہ مستشرقین کہن وجدید راجع بہ این زبان وگویندگان ایشان چہ نظریات داشتہ اند، ونزدیکی این زبان با زبان سانسکریت کہ کہن ترین زبان جہان محسوب می گردد از نظر این دانشمندان چہ ہست؟، البتہ این نظریات نہ تنہا این کہ ارائہ شدہ است بلکی ہریکیشان ازمنظر زبان شناسی تاریخی وجغرافیایی مستدل تحلیل شدہ است.

کلمات کلیدی:

آریانا، پشتو، اوستا، سانسکریت، زبان، زبانہای ہندو آریایی، مستشرقین، زبان شناسی مقایسوی

مقدمہ:

زبانہای ہندوآریایی زبانہای سرزمین ہاپہنہ واری استند کہ از کریمیا آغاز می شود، تا سرزمین ہای روسیہ، افغانستان، ہند و دیگران وسعت دارد، این زبانہا از لحاظ تاریخی وساختاری خویشاوندی بسیار نزدیک دارند چون از یک منشاء نشئت کردہ اند پس

خویشاوندی ایشان به همین اندازه نزدیک است. زبان پشتو که اساس این تحقیق است در این زبانها جایگاه خاص خود دارد که با زبانهای سرزمین هند نزدیکی های خاصی خود دارد.

زبان پشتو یکی از زبانهای کهن آریانا زمین است که در آریانا مرکزی از هزاران سال بدینسو به این زبان سخن رانده میشود. این زبان از لحاظ ساختاری وگفتاری به دو زبان دیگر بسیار کهن اوستا و سانسکریت بسیار زیاد شباهت و نزدیکی دارد که این امر باعث این گردیده که این زبان (پشتو) در ردیف کهن ترین زبانهای جهان جا بگیرد. بخاطر این که گوینده های این زبان در آسیا میانه در چهار راهی جهان جا گرفته و همه ابر قدرت ها همیشه از این راه کوشش کرده که جهان دیگر را تسخیر نماید به این اساس این زبان همیشه زیری تاخت وتاز قرار گرفته وآثار کهنش از بین رفته و کهنه ترین سند کتبی اش که هنوز به دست ما رسیده به سده دوم هجری ارتباط میگیرد که یک شعر فخریه از امیر کروڑ سوری است.

زه یم زمری پردی نڑی له ما اتل نه سته

(من شیرم، برروی زمین پهلوان تری ازمن نیست)

په هند سند و پر تخار او پر کابل نه سته

(درهند وسند ودر تخار و کابل نیست)

بل په زابل نه سته

(درزابل هم نیست)

له ما اتل نه سته

(پهلوان تری ازمن نیست)

(هوتک: ۵۳)

راجع به پشتونها وپشتو که در این جغرافیه زندگی می کند ونفوسش به نو دمیلیون نفرمی رسد(مرهون ، 1397: 345) همیشه نظریات و دیدگاهای متفاوت وجود داشت که اکثریت شان برآرین بودن این زبان واین قوم می چرخد. در این تحقیق که آرین بودن

این قوم از دیدگاه های شرق شناسان به ثبوت رسیده نظریات این شرق شناسان بر اساس زبان شناسی تحلیل وپیش کش گردیده اند.

زبان های جهان ازنظر زبانشناسی یک هویت دارد که بانظر داشت اصول زبان شناسی ساختار های زبانی اوخویشاوندی با زبانها دیگر نزدیک و دوراز لحاظ ساختاری، لفظی و معنایی بحث میشود واز لحاظ تاریخی یک هویت دیگری دارد که بانظر داشت جغرافیه بحث می شود که این زبان در کدام جغرافیه حرف زده می شود؟، چقدر انسانها تکلم می نماید؟ و چقدر جغرافیه را از چه زمان در بر گرفته؟ ولی در جهان معاصر یک بحث سوم هم به وجود امده که ما میتوانیم یک زبان را از هر دو منظر در یک وقت مطالعه نمایم که این بحث را به نام زبان شناسی تاریخی نامیده میشود. در این مبحث ما میتوانیم که زبانها را در یک مقطع تاریخی، در یک جغرافیای واحد اوبا همجواری ونزدیکی باز بانهای دیگر مطالعه نمایم.

روشها:

در جهان امروزه و در تحقیقات گوناگون متوجه این مسئله شده ایم که اکثریت محققین روش های تحقیقاتی رابا انواع تحقیق مغالطه می نماید.

روش تحقیق این است که تحقیق که صورت می گیرد در کجا و از چه مدارک کار گرفته میشود (هیوادمل، 19:1387). ونوعیت تحقیق این است که به چه شیوه از بحث خود دفاع می شود آیا استدلال فلسفی است؟، مقایسوی است؟، تاریخی است و یا هم نوعیت های دیگر؟ من در این تحقیق از روش کتابخانه ای کار میگیرم چون همه آثار راجع به این مبحث که به گونه تاریخی است قبل از قبل ثبت وتحقیق شده اند مگر این که تا چه حد درست است و مقایسوی دیده نشده اینجا همه زیری بررسی قرار گرفته ودانه دانه مطالعه، مقایسه وبعد از تحلیل مستند تایید و یا هم رد میشود واین که به چه نوعیت رد و یا تایید میشود این بر میگردد به نوعیت تحقیق، پس نوعیت تحقیق من گونه مختلط است که از همه گونه های تحقیقی کار گرفته میشود هم از نوعیت مقایسوی هم تاریخی هم فلسفی وهم دیگر.

بحث :

وقت کہ راجع بہ زبان بحث میکنیم ہمیشہ در یک جغرافیہ بودہ. ملت ہای جہان از لحاظ مجاورت اگر نزدیک اند زبانہا ہم از مجاورت فاصلہ ہای بسیار نزدیک بہ ہم دارند.
کنت کاتسنر راجع بہ مجاورت ونزدیکی زبانہا جہان دراثر (زبانہای جہان) خود مینگرد:
امروزہ شمار زبانہای دنیا بہ ہزار ہا سر می زند. برآورد رقم دقیق وحتی تقریبی زبانہا عملی نیست زیرا بسیاری از آنہا گمنام اند واز این گذشتہ کشیدن خط ومرز کاملاً مشخص بین زبان ولہجہ ناشدنی است. در بسیاری موارد ہچنان کہ بہ سفر در یک منطقہ ادامہ می دہیم درمی یابیم کہ یک زبان رفتہ رفتہ با زبان مجاور خود درہم می آمیزد، تابدانجا کہ تشخیص دقیق اینکہ بہ کدام زبان تکلم میشود ناممکن می گردد. (کتسنر، 3:1376)

این پاراگراف (در بسیاری موارد ہچنان کہ بہ سفر در یک منطقہ ادامہ می دہیم در می یابیم کہ یک زبان رفتہ رفتہ با زبان مجاور خود درہم می آمیزد، تابدانجا کہ تشخیص دقیق اینکہ بہ کدام زبان تکلم میشود ناممکن می گردد) برای ما یک تئوری جدید بہ دست می دہد کہ ما می توانیم براساس مطالعہ یک زبان، زبان دیگر ہجوارش را از لحاظ تاریخی وجغرافیایی بہ بسیار آسانی شناسایی کردہ بتوانیم. ونظریہ ی برآمدن زبانہا از یکدیگر را بیشتر بہ ثبوت می رساند.
بحث ما کہ اساسش مقایسہ با زبانہا دیگر است نتیجہ اش این خواہد بود کہ مجاورت ہمیشہ تنہا جغرافیای نہ بودہ بلکی اجتماعی وزبانی ہم بودہ واین مجاورت تا حد اکثر بہ سرحد خویشاوندی میرسد. اساس ہر جامعہ گروہ ہای خورد مردمی می باشد وگروہ ہای مردمی ہمیشہ خویشاوندان و خانوادہ می باشد. زبان ہا ہم مثل انسان ہا مادر، خواہران ودختر دارند این کہ زبان در بیشتر زبانہا اسم مونث بودہ بہ این اساس خویشاوندی آن ہم براساس مونث گردان میگردد.
ماوقت کہ راجع بہ یک زبان بحث می نمایم از زبان مادر واساس شروع می کنیم، جغرافیہ اش پیدا می نمایم وبعد از یافتن جغرافیہ واصل زبان ما می توانیم اصالت زبان متولدہ را بہ آسانی پیداوزیری بررسی قرار دہیم.

درمقدمہ گفتیم کہ بیشترین ادعا ہا کہ بہ اثبات ہم نزدیک است راجع بہ پشتو نہا این است کہ پشتو وپشتو نہا آرین است. قبل از آن کہ بہ این بپردازیم کہ پشتو نہا کہ استند وپشتو از کجا شدہ اولاً باید آریانا زمین وآرین ہا را بشناسیم تا کہ بہ اصل موضوع برسیم وجایگاہ پشتو نہا در آرین وجایگاہ زبان پشتو در زبانہای آریایی را دریابیم.

پروفیسور ویلسون می نویسد (۱۸۴۱ع) کہ افغانستان امروز با سرزمینی ہم ساحہ میباشد کہ بین فارس و ہند قرار داشت و یونانی ہای قدیم آنرا آریانا (Ariana) میخواندند. این سرزمین درلسان ہای مختلف بنام ہای نسبتاً مختلف ولی مشابہ بہمدیگر یاد میشد: درفارسی قدیم بنام آیریا (Airya) یا ایریانا (Airyana) درسانسکریت بنام آریاورتہ (Arya-Vartta) یا آریاورشہ (Arya-Varsha) کہ برای منطقہ ہرات بکار بردہ میشد از کلمہ سانسکریت آریا (Arya) بہ معنی اعلی وارجمند مشتق می باشد باینصورت آریانا بہ معنی (کشور ومردمان اعلی ومحترم) میشود.

آریانا بیشتر یک نام جغرافیایی بود تا سیاسی. حدود آن ہم کاملاً معین نبود. درشرق بہ دریای سند ودرجنوب بہ بحر ہند متصل بود. درغرب یزد وکرمان شامل آن بود ولی فارس خارج از آن قرار داشت. درشمال کوہ ہای پاراپامیزوس (Parapamisus) سرحد آن بود. (کاکڑ، 2،1:1357)

نظریات محققین آفغان ومستشرقین راجع بہ آریانا وآریایی ہا تقریباً یکی است ولی تفاوت ہای بسیار اندکی دارد کہ بعضاً قابل ملاحظہ ہم می باشد. درکتاب ہای مدرن زبان شناسی تاریخی وکتاب ہای تاریخ تقریباً ہشتاد فیصد ہمخوانی وجود دارد مگر باز ہم قابل ملاحظہ است کہ این بیست فیصد را مطالعہ گردد یکی از اُدبا، مورخین واہل خبیرہ ی شہیر افغانستان پوہاند اکادمیسن جاوید درکتاب (اوستا) خود راجع بہ آریایی ہا یک بحث طولانی دارد کہ پارہ از این بحث اینجا نقل قول می دارم:

(آریاییہا بنابر روایت زند-اوستا محل سکنا و مامن اصلی خود را ایریہ وجنگہہ

(Airya-Vaejangh) ایر یانیم وتیج (AiryanamVaejah) یا ایرینہ ویڑہ (ErienVeejo) یعنی سرزمین آریاییان میخوانند. درمتن پہلوی وندیداد آمدہ: من، اورمزد، نخستین محل و سرزمینی را کہ بہترین آفریدہ ام ارہ وتیج (Ira Vej) ایران وج (Eran-Veji) بود... کلمہ ایرج (Eraj) صورت مختلف و یادآور ہمان واژہ ریشہ اوستائی است کہ بہ پہلوی وفارسی دری ایران وتیج (Vej) تلفظ می شدہ است.

این لفظ در سنسکریت آریا ورتہ (Arya-Vartta) یا آریا ورشا (Arya Varsha) ضبط شدہ است. یعنی جایگاہ و چراگاہ آریاہا کہ محتملاً دامنہ ہای شمالی ہندوکش و حوزہ رود آمو (اکسوس) یا جیجون بودہ است. مارکوارت در کتاب معروف خود ایرانشہر مینویسد: آئیر یانم ویجو (ایران وتیج) (Airanem Vaejo) یعنی ایران وتیج یا سر زمین اصل ایرانیان ہمین خوارزم است.

درصورتی کہ تا سرچشمہ ہای زرافشان، آمودریا و سیردریا، درطول تاریخ ایرانی نشین بود. ازسوی دیگر آرتور کریستن سن آریارا از نام اقوا آورس (Aures) کہ از قرن دوم پیش از میلاد در خوارزم می زیستہ اند مشتق می داند. فرای در تاریخ ایران باستان آوردہ است: بسیاری از دانشمندان سرزمین باستان ایرانیان (آریانیم ویجہ (Airyanem Vaejah) را خوارزم تشخیص دادہ مطابق با نام محل ہایی کہ در وندیداد (۱،۲) ذکر یافتہ است.) (جاوید، 12:1378)

بعد از این تشریح نام آریانا زمین، پوہاند جاوید تاویلات دیگری راہم بسیار زیاد از ماخذ ہای قوی جہان آوردہ اند و تشریح بخر ذکر کردہ اند مگر مہم بحث در اخیرش راجع بہ جغرافیہ آریانا زمین است کہ بدنخواہد بود کہ اینجا نقل قول گردد:

(بارتولد سرحد این آریانا و یا ایران را بہ قرار ذیل دادہ است: در شرق ہند، در شمال ہندوکش وسلسلہ ہای جبالی کہ درغرب آن واقع است و در جنوب اقیانوس ہند سرحد غربی از دروازہ خزریعنی از معبر کوہستانی واقع در شمال تہران شروع شدہ و در خطی کہ پارت

رااز مدی وکارمانیا(کرمان)رااز پرسید(فارس)جدامیکرد امتداد داشته است.

درصفحه چهاروجه تسمیه شهرهای ایران میخوانیم: کلمه آریانا از نام جغرافیایی وسیاسی آریا نام خشتر ام(Aranamxsatram)اشتقاق یافته.واراتشاونس(Eratosuens) جغرافیدان وکتابداراسکندر آنرا در کتاب خود بنام آریانا بکار برده وآن را در نیمه دوم قرن سوم قبل ازمیلاد به شکل یونانی آن یعنی(Ariane)می یابیم.

دانشمند معروف یونان بنام آرییان (Arrian) در کتاب خود زیر عنوان اسکندر کبیر حاییه از سوارکاران باختر(Bactrians) سغدی(Sogdians) اراکوزیا(Arachotians)وزرنج(Zarangian)و پارتی(Parthians) نام می برد از مردمان (Areins) یادمیکند. بطلیموس (Ptolemy) جغرافیدان معروف اسامی هفت ولایت معروف آریانا را یک به یک برشمرده وچنین ضبط کرده است:

مارگیانا، بکتریانا، آریا، پاراپامیزوس، زرنجیانا یا درنجیانا، اراکوزیا، گودرزیا و دیگر......)(جاوید،1378: 19-54)

ولی تشریح جغرافیه به این گونه تیت و پرک همه از مورخین پیشکش نموده اند اما مورخ شهیر افغانستان علامه پوهاند حبیبی در کتاب(دپ تواد بیا تو تاریخ)خود این جغرافیه را به شیوه احسن برخواسته های امروز تقسیم کرده واین گونه توضیح می دارد که این توضیح او میتواند ما را برای بحث اصلی ما یاری برساند اما قبل از توضیح وی یک نقطه قابل یادآوری است که آریایی ها قبل از آمدن به منطقه فعلی آریانا ویا هم آغاز تمدن بختی درسرزمین پهناورزندگی می کردکه براساس مطالعات مورخان می توان گفت که درنواحی بحیره سیاه بودن وآز انجا به غرب امروزی یعنی اروپا وبعضی مناطق غربی آسیا وهمچنان به سرزمین های روسیه بزرگ عازم گردیده اند اما بحث که ما بیشتر موردعلاقه قرارگرفتیم ازمهاجرت دوم که طرف کوه های هندوکش صورت گرفته،است.

علامہ حبیبی راجع بہ این آریایی ہای فعلی اینگونہ نظر دارد:

(قبلاً گفتیم کہ آریایی ہا از طرف شمال افغانستان فعلی آمدند و دریایی گذر کردند او در باختر یک تمدن زیبای را ساخت و بعداً با مرور زبان این آریایی ہای مرکزی بہ سہ حصہ تقسیم شدند:

1: مرکزی یا باختری:

اینہا در دامنہ ہای شمالی وجنوبی ہندوکش زندگی می کردند او در کوہا و دشت ہای مامن ماجا گزین شدند. از لبہ اباسین تا دشت ہای خراسان وآمومملکت اصلی ومرکزی اینہا بود. بلخ، تخارستان، ہرات، اراکوزیا، کابل، گندہارا، سگستان (ساکستان)، خراسان حصہ ہای مشہور این سرزمین بود واین منطقہ درجنوب با بحیرہ عرب احتوا گردیدہ بود.

۲: مادیک:

یک گروہ اقوام آریایی از بلخ بہ طرف جنوب غربی از ہریوا (ہرات) از خراسان گذشتند سرزمین پارس را گرفتند و ایران امروزی را ایجاد کردند. مورخین کوچ کشی این مردمان را از چہاردہ قرن قبل میلاد تا ہفت قرن قبل میلاد تخمین می زند. آین مردمان نخستین دولت خویش را بہ نام ماد (Media) درسدہ ہفت قبل المیلاد بنیاد گذار کرد.

۳: ویدیک:

این گروہ ہای آریایی از طرف باختر و ہندوکش بہ طرف کابل وخیبر رفتند واز اینجا گذر کرد طرف سرزمین سپتا سندو (سرزمین ہفت دریا (ہند فعلی) و در این سرزمین جا یگزین شدند. اینہا از اباسین یا آموگذر کردند در جنگلات وسرزمین سرسبزبین آمو وگنگا برای خود یک تمدن بزرگ را ایجاد کردند کہ بہ نامہ ویدیک مشہور بودند. مہاجرت این اقوام ہم از چہاردہم قرن قبل المیلاد آغاز می گردد. (حبیبی:1395:48-49)

تا اینجا فہمیدیم ویا فتیم کہ آریایی ہا بہ سہ حصہ تقسیم گردیدہ وپشتونہا کہ اصل بحث ما

استند فعلاً درسرزمین مرکزی اریانا تاریخی زندگی می کند پس از اینجا معلوم می شود که پشتونها از همان اول در آریانا مرکزی زیست داشتند و دوتمدن دیگر ماد و وید یک که زبانهای ایشان اوستا و سانسکریت بود مشهور ترین زبان آریایی های مرکزی پشتو بود چون از لحاظ ساختاری، الفاظ و گردان افعال هو به هو به زبانهای سانسکریت و اوستا یکسان است مگر به جای این که راجع به این مسئله بحث بیشتر کنیم لازم است نظریات مستشرقین شهیر جهان که راجع به پشتو و پشتونها نظریات را ارائه کرده اند مراجعه نمایم.

اغاز ین بحث که راجع به پشتونها وجود دراد در کهن ترین کتاب اوستا و ویدا اند. تحول نام یک مسئله ی بسیار عام و عادی تاریخ بشر است. نام قوم پشتون در تاریخ چندید بار مثل اقوام دیگر تغییر نموده اند در حال حاضر پشتونها نزدیک به چهار نام مشهور اند پشتون، پ تون، پختون، پتان و دیگر. همینگونه در تاریخ هم این نام چندین بار تغییر کرده.

اولین بار که راجع به نام قوم پشتون بحث گردیده در ویدا اند. در کتاب ویدا یک بحث بسیار مہمی راجع به جنگ ده قبیله آریایی بحث شده که نام پشتونها در این ده قبیله در شروع آمده اند. این ده قبیله بر اساس ذیل اند:

پکتہ (Pakthas) (پکتویس = پکھت = پ تون)

الینا (Alinas) (مردم ولایت نورستان فعلی افغانستان)

بہالانا (Bhalanas) (مردم دره بولان)

شیوا (Shivas) (مردم شیوکی که درنزدیک دریای آمو زندگی داشتند)

ویشانن (Vishanins)

انو (Anus) اینہا در پہلوی دریا راوی پنجاب زندگی می کردند و خانواده مشہور روحانی بریگوس سرکرده اینہا اند.

درہیو (Druhyu) (این اقوام ہم با انوہا زندگی می کردند.)

توروا شا (Turvasha)

یادو(Yadus)(این دوقبیله اتحاد داشتن)
پورو(Purus)مردم مناطق گندهارا

در این بحث شامی بینید که نام پکتوس که از لحاظ تاریخی همین پشتونها است یا دوری گردیده بغیر از این درجاهای متعددی دیگر هم از نام پکتها، پکته ودیگر کلمات مرتبط به پشتونها امروزی یادآوری میگردد.

درویدا نام پکتها به معنی پادشاه پشتونها یا نام پکهت به معنی قوم پشتون چندین مرتبه تذکر یافته اند. درترجمه مشهوررالف. اے. ایچ. گریفت که در دوجلد از ویدا ترجمه گردیده نامه پکهت دراینجاها تذکر یافته اند:

جلددوم،صفحه ۸۱،حصه هفت،سرود.۱۷

جلددوم،صفحه ۳۵۱،حصه هشت،سرود.۲۲

جلددوم،صفحه ۲۶۰،حصه هشت،سرود .۱

جلددوم،صفحه ۵۶،حصه ده،سرود .۱۶

ودراینجا دوسرود از ویدا را به تو رنمونه میاریم که نام پکهت در آن یادآوری گردیده اند: بهریگوس ودرهیوس عاجلتاً گوش گرفت یک دوست برای دوست دیگر برای دوقبیله دورنجات بخشید .. مرمان پکهت، بهالا، الینا،شیوا و ویشانن جمع گردیدند، دوست آریایی برای راهنمایی به قبیله تریتسو آمد. آمدن دلاورانه او به این سبب بود که با جنگ علاقه داشت.

از این سرود فوق معلوم می گردد که این اقوام در بین یک اتحاد داشتند و برعلیه اقوام دیگر یک صف واحد داشتند.

یاهم شمادراین سرود دیگه می خوانید:

ای اندرا! شما بسیار بزرگ هستید. از شامی طلبم برای ما گاوه های شیری بدهید. مثل که به مدهه پاتی تیاونی پاتی تیا(دوشاعرمشهورآن زمان هستند) عطافرموده اید. مثل

کہ بہ قوم کنواوشہزادہ تراسادسیو، پکتہ (شاہ پشتونہا) وداس اوراجاعطافرمودہ اید.

دراین سرودہم دیدہ می شود کہ نام شاہ پشتونہا یادگردیدہ است. بعداز ویدا در اوستاہم بحث ازشترہا بلخی شدہ اند. درآن زمان کہ پیمانہ دیگروجودنداشتند مردمان بحث حساب رابر پیمانہ ہای خاص می کردند مثلاً برای خریدن یک زمین نرخش این گونہ می گذاشت کہ برای من صد شتر بلخی گندم بدہید کہ این چیز را برای شما بدہم. یعنی پیمانہ واندازہ براساس معیارہای خاصی بودند. دراوستا ازشترہای بختی یا بلخی یادوری گردیدہ اند وہمین بلخ، بخت، بخدی ہمان ارتباط بہ آریایی ہای مرکزی دارند کہ پشتونہا درآنجا زندگی می کردند.
وقت کہ بہ بحث ہای علمی یا تحقیقی می نگریم تاریخ ترین بحث آغازش ازیونان می گردد بہ این اساس درتاریخ وعلم امروزی یونان وعلوم یونانی بہ مثابہ تاریخی ترین وموثق ترین آثار یاد میگردد. مورخین یونانی راجع بہ پشتونہا بحث ہای گوناگونی دارند کہ ہرکدامشان درجای خود قابل پذیرش وقابل بحث اند.

مورخ وجغرافیدان شہیر یونان ہرودوت (448-452 ق،م) درجغرافیہ مشہورخویش ذکرپشتونہا می کند. وی کشورپشتونہا رابہ نام پکتیکا یادی می کند. کہ درپہلوی دریا اندوس واقعیت دارد ومردمانش خیلی دلیروقوی استند. اینہا کالای پوستین می پوشند تیرو کمان وطنی، کارد ہا کلان دارند و بہ سیما وصورت وحرکت ہا بہ مردمان باختری می مانند. (ہنری.2:1875)

وقت کہ سکائی لاکس امیرالبحریونانی ازطرف داریوش برای کشف سواحل بحیرہ عرب مامورگشت وی ازراہ کاسپیتروس وپکتیکا بہ این ساحل رسید. اودرسیاحت نامہ خوداز پکتیکا ذکرنمودہ است. وعلاوہ براین ہرودوت درستراپی ۱۳ ارمنستان ہم ازپکتیکا ذکرمی نمایدواینہا بخش ازپشتونہا استند کہ بہ آرمینیا رفتہ اندوآنجا جاگزین گردیدہ اند.
جغرافیہ شناس دیگری یونانی بطلیموس کلودیوس است اوہم کشورپشتونہا راپکتین یادکردہ اندواوعلاوہ می کند کہ پکتین ہا درجنوب پاروپامیزاد زندگی می نمایدواین مسکن پتکین

ہا استند. (حبیبی:1359: 69-75)

این کہنترین یادآوری ہا از نام پشتون، پختون، پکتون، پکتویس، پکہت، بخت، بختی و کلمات دیگر بود کہ بحث دیگر ہم دارد مگر متقسیماً راجع بہ قوم پشتون امروز ہم مستشرقین نظریاتی زیادی راارائہ کردہ اند کہ بعضی ایشان رابرای شما پیشکش می نمایم:

امیل بنونیست در کتاب مشہور خویش صنف بندی زبان ہای اندوآریانی پشتو را درزبانہای ہندآریانی درزبان ہای شمالی شرقی زبان ہای آریایی می شمارند. (بن وینیست: 1356:1-21)

جیمز دارمستتر مینگرد: از روی بحث واک شناسی دانستیم کہ زبان پشتو مشتق از ہیچ زبان ہندی نیست بلکہ از خانوادہ آریانی می باشد و در این دستہ بہ عین شعبہ اوستا ملحق میگردد. اکنون با مطالعہ وشکل شناسی یعنی صرف مجدداً تایید می شود کہ زبان پشتو زبان ہندی نیست بلکہ آریانی می باشد و بہ ہمان شعبہ وصل میشود. کہ زبان اوستا از رویدہ بود. تاریخ صرف پشتو نشان میدہد کہ شاخہ زبان پشتو غیر از شاخہ زبان دری می باشد. گرچہ ہردو زبان شامل یک خانوادہ مشترک آریانی می باشند از روی مطالعہ صرف می برآید کہ از چندین قرن بااینسو ہریک از این دو زبان از نظر صرف واشکال صرفی از خود تحول جداگانہ داشتہ اند. زبان آریانی قدیم کہ از آن زبان اوستا و یک زبان دیگر یعنی پارسی باستانی مشتاق شدہ است، با زبان ہم ریشہ آن یعنی زبان اولی ہندی مادر سانسکریت یک شباہت عمدہ داشت اوستا پارسی باستانی و سانسکریت ہمہ زبانہای ترکیبی بودند: اسما در حالات مختلف، اشکال مختلف داشتند بعداً درزبان دری این خصوصیت از میان رفت اسما شکل واحد گرفتند (و بجز مفرد وجمع دیگر تفریقی درآن باقی نماند) پس زبان دری در این طریق پیہم تحول نمودہ اما پشتو بسا از مشخصات باستانی را پاسداری کردہ است.

زبان پشتو از این جہت درمرحلہ قدیمتر واقع است البتہ از جہت گردان افعال بیشتر تحول کردہ است. (دارمستتر:1356:101)

مگر بحث فوقانی دار مستنتر قابل تامل است. این بحث بحث منطقی است کہ زبان پشتو با زبانہای اوستا و سانسکریت نزدیکی و شباہت ہای فوق العادہ زیادی دارند و اوستا و سانسکریت کہن ترین زبانہای جہان و منطقہ اند از لحاظ گفتاری مردہ اند و از لحاظ نوشتاری در یک محدود و خاص زندہ اند مگر زبان پشتو با آن ہمہ مشخصات کہ این دو زبان دارد ہم از لحاظ گفتاری و ہم از لحاظ نوشتاری زندہ است وقت کہ بہ پارسی امروزی می نگریم بسیار بہ وضاحت متوجہ می شویم کہ از لحاظ ساختاری شباہت ہای زیادی بہ زبانہا مغولیک و ترکیک دارند پس این موضوع کہ در نتیجہ تحول بہ اینجا رسیدہ چندان زیاد باور کردنی نیستند چون چرا زبانہای دیگر کہ ہمراہ ایشان در یک بسترہ زندگی می کند تحول نمی کند و تنہا این زبان بہ این تیزی اینقدر تغییر زیاد می کند قابل تامل است.

پروفسور کلی پورت راجع بہ زبان پشتو می نگرد:

زبان پشتو گر چہ بعضی از پژوہشگران از زبان ہای سمیتیک (Semitic) یا زبانہای سامی شمردہ اند مگر من می گویم کہ این زبان از زبانہای سوچہ اند ژرمانیک اند (Indu-Germanic) بہ خاطر کہ نہ از لحاظ الفاظ و کلمات و نہ ہم از لحاظ گرامری بہ زبان ہای سامی نزدیکت نہ دارد.

پروفیسور دورن در پتر زبورگ زندگی می کرد در سال (1847ع) یک کتاب را راجع بہ پشتو پخش کرد در او می نگرد زبان پشتو نہ از لحاظ ترکیب، نہ لغات و نہ ہم در گرامر با زبان عبرانی و چالدیک مشابہت دارد. بہ خاطری کہ این زبان از زبانہای اندو تیوتن است و پشتو نہا باشندگان اصلی و دیرینہ افغانستان اند. (حبیبی:1395:82)

مورگنستیرین راجع بہ پشتو نہا می نگرند:

پشتو یک زبان عمدہ شرق است کہ تعدادی گویندگان آن بہ ملیون ہا می رسد (حتی در ایران پنجاہ ہزار گویندہ دارد).

گر چہ کلمہ افغان در کتب قدیم سابقہ زیاد دارد مگر کلمہ پشتو قدیمتر و اصیل تر

است. کلمه پتهان که در هند معمول است و در زبان انگلیسی هم داخل شده است. ازشکل قدیم تر کلمه پشتو گرفته شده است که مطابق استدلال ی زبانشناسی پشتان بوده است. (مورگینستر ین:211:1356)

مورخ وزبانشناسی شهیرادلنگ مینگر:

گرچه من در پشتو معلومات زیادی را نه دارم ولی از ساختار وقدیم بودن این زبان اینقدر می دانم که از کهن ترین واصیل ترین زبانها است.

مورخ شهیر جهان الفنستون راجع به پشتو نها می نگرد:

بنیاد وریشه زبان پشتو به آسانی معلوم نمی شود بخاطری که بیشترین الفاظ که این زبان از ایشان ساخته شده وادات زیادی این زبان بگونه ی استند که اصل وریشه هایشان معلوم نیست واین آن اجزا اصلی زبان به شمار می رود. باز بعضی از این الفاظ نزدیکی بازند و پهلوی دارد. مثلاً پلار، مور، خورورور... وی افزاید که من بر (218) کلمه زبان پشتو تحقیق کردم هیچ کدامشان نزدیکت با زبانهای سامی نه دارد ولی در این کلمات پنج درصد کلمات استند کا به زبانها کردیش نزدیکی دارند وزبانی کردی هم از زبانهای هندوژرمن استند. به همین استدلال میتوان گفت که زبان پشتو هم از همین زبانها است.

(الفنستون:302:1867)

مگر استدلال فوقانی الفنستون از لحاظ زبانشناسی امروز زیری سوال است بخاطری که زبان پشتو از زبانهای کردیش به زبانها پامیری و بدخشانی شباهت ونزدیکی بیشتر دارد خوبترین نمونه اش صدا ((ش/ پشتو) است که در تمام زبانهای پامیری وهمچنان در زبانهای هندواروپایی دراوکراینی، روسی، آلمانی، فرانسوی یکسان ونزدیک به (ش) مگر سقیلتر تلفظ می شود.

مستر جورج راورتی از شرق شناسان معروف استند که در شرق وبلخصوص در هند تحقیقات وتالفات زیادی را دارند. یک گرارمر را نگاشته که در (1856ع) در کلکته به

چاپ رسیده است. درمقدمه این کتاب مفصلاً راجع به زبان پشتو بحث می کند ساختار زبان پشتو، گرامر وکلماتیشان با زبانهای سامی مقایسه می کند. ودراخیر به این نتیجه می رسد که بین زبانها پشتو، زند و پهلوی شباهت ها ونزدیکی زیادوجوددارد. وی افزاید درکتابهای اسبق پشتو مثل زندحروف به جای حرکت ها نگاشته شده است به این خاطر من میگویم که با سانسکریت و زندنزدیکتی داردو به باپهلوی خویشاوندی زیادی دارد۔

منصبدارنظامی در بنگال به نام والتر بلیوزندگی می کرد و علاقمند به زبانها بود و تالیفاتی زیادی راراجع به گرامروزبانهاداشت اوراجع به اصالت زبان پشتو مینگرد:

از همه تحقیقات خودم به گونه مختصر گفته می توانم که زبان پشتو خواهر دیرینه زبان سانسکریت است و به خاطر این که درمیان هند و پرسیا(ایران) واقع شده و به قرن ها سرشان گذاشته ازاین خاطرتاثیرات زیادی از پارسی براین زبان واردگشته والفاظ یشان را دیگرگون ساخته اندمگر با وجود این همه تاثیرات قواعدخود را از دست نه داده او این تاثیرات راهم درقالب خودانداخته وطابع ساختار های زبانی خودکرده اند.

(بیلیو، 11:1956)

دارمستتر که قبلاً هم تذکرش شددرکتابی دیگرراجع به زبان پشتومی گوید: زبان پشتو از لہجه های هندی نیست و نه هم از پارسی و پهلوی به وجودآمده اند. بلکه این زبان به زند(اوستا) ویاهم به زبان دیگری مثل اوستاشباهت زیادی دارد.

مورخ دیگر دکتر ارنست ترومپ است. وی هم در سال (1873ع) گرامرپشتورانگاشت ودرکتاب خودراجع به اصل وریشه زبان پشتو وپشتونهامینگرد:

من به وضاحت وعقیده مطلق می گویم که زبان پشتو از زبانهای غربی (ایرانی) نیستند. بلکه زبان اصلی اندوآرین است مگر باوجوداین باز هم هندی کامل گفته نمی شود بلکه از زمان های قبل این یک زبان مستقل بوده است ودراول هم از زبان های هندی وایرانی جداشده است وباز هم به هردوشباهت ونزدیکی داردو یک زبان برجسته ومقتدراست.

دکتر هنری که یک محقق فرانسوی است می نگرد: زبان پشتو در بعضی جاها به زبان سانسکریت و در جاهای دیگر به اوستا نزدیک است. مثلاً لواحق که بر کلمات مانده می شود و زبان اوستا و سانسکریت در این مشخصه با یکدیگر بسیار نزدیک است زبان پشتو هم در این مشخصه با این دو زبان مشابه و مشترک اند.

در گردان افعال و مسئله فاعل و مفعول نزدیکی زیاد به زبان زند دارند. و از مخالفت اختتام کلمه که اوستا و سانسکریت با هم دارد زبان پشتو به زند نزدیک می شود و بعضاً هم به سانسکریت نزدیک می شود. از این همه نزدیکی ها و مشابهات آشکار معلوم است که این زبانها از یک منبع برآمده اند. وقبل از انشعاب زبانی آریایی این زبانها با هم نزدیکی زیاد داشتن او یا هم معلوم می شود که در حدود دوالی سه هزار سال این زبان ها ارتباطات متوالی داشتند.

مستشرق شهیر روسیه پروفسور برتلز در انستیتوت لنینگراد راجع به زبان پشتو اینگونه نظر دارد:

زبان پشتو با تاریخ طولانی خویش با قوت خاص خود را حفظ کرده است. در زمان های طولانی بعضی تغییرات هم برایش وارد گردیده اند مگر این تغییرات به گونه پارسی نه بود بلکی زبان پشتو با قوت خاص خود هم لغات و کلمات که در آن وارد گردیده در قالب خود گنجانده اند وحصه از خود ساخته است.

ارنست ترومپ می گوید:

زبان پشتو یک بخش مستقل زبانهای آریایی است و بین زبانهای هندی و ایرانی واقع شده است. این نظریه ترومپ را دوکتور هارنل و پروفیسور فون سپیگل به بسیار شدت هم می پذیرد و هم تایید می کند. گریرسون و پال تی دیسکو هم این موضوع را تایید میکند. (حبیبی،1395:82-86)

میجر لوریمر و بهچنان پروفیسور جی، ای، گریرسن که کتاب لینگویستیک سروی اف آندیا را در ده جلد نگاشته راجع به زبان پشتو همین نظریه فوقانی را دارد که زبان پشتو یک

زبان آریایی است که به زبانهای کهن آریانی مرکزی شباهت های زیادی دارد.

نتیجه گیری:

این تحقیق این را به ثبوت رسانده که تمدن آریایی کهن ترین تمدن جهان است که مرکزش درافغانستان فعلی بوده واین مرکزیت معهد وگهواره زبانهای کهنه جهان بوده که تاهنوز کهن ترین آثار زبانی وتاریخی (گرامر پانینی، اوستا و ریگویدا) از این خیطه تاریخی در جهان موجوداست ودرتمام پوهنتون های زبانشناسی جهان به این آثار به گونه اولین آثار زبان وزبانشناسی مراجعه می شود.

وپشتونها قومی بسیار تاریخی از آریانا کهن است که درآریانا مرکزی زندگی می کردندو با امرار زمان ازشمال افغانستان فعلی به تمام افغانستان، نصف پاکستان وحصات از ایران وهندت ت وپرک شده اند.

از نظریات مستشرقین این به ثبوت رسیده که زبان پشتو یکی از کهن ترین زبان های آرین زمین بوده که از زبان اریک با زبانهای دیگر که مشهورترین ایشان اوستا و سانسکریت استن نشئت کرده وفعلاً گروه از زبانهای هندیک که مادرش سانسکریت است و گروه دیگری فارسیک استن که مادرش اوستا است وگروه دیگر که هنوز به بحث وتحقیقی زیادکار دارند به نام افغانیک یادمیشود که مادرش پشتو است ولی زبان اوستا وسانسکریت از لحاظ گفتاری از بین رفته اندمگر زبان پشتو از هردولحاظ یک زبان زنده ودر چندین کشورمخیث زبان رسمی وملی از ایشان استفاده میگردد.

از لحاظ دیگر این به ثبوت رسیده که پشتونها وپشتو از مکان دیگر به اینجا نرسیده بلکی زبان همینجا بوده وبن اسرائیل بودن پشتونها وپشتو یک فرضیه ودسیسه سیاسی اوتاریخی بیشتر نیست.

زبان پشتو از لحاظ ساختاری، تلفظی وتاریخی نزدیک ترین زبان جهان به زبانهای بسیارکهنه جهان اوستا وسانسکریت بوده واین امر ثابت می کنند که زبان پشتو به

اندازه این دو زبان قدمت واصالت تاریخی دارند مگر این که از تمدن دور مانده باعث این شده که خود را زنده نگاه دارد و پیشرفت نماید.

یادداشت:

در این مقاله از منابع به دوگونه استفاده گردیده منابع مستقیم و منابع مطالعاتی، منابع که در متن مقاله در حاشیه قرار دارد نقل قول از نقل قول است و در منابع اخیر هم بعضی از منابع که از مطالعه اش تاثیری بر این مقاله به خاطری اصل امانت داری از همان منابع هم یادوری گردیده اند.

منابع:

ابوالقاسمی، محسن. (1378 ش). تاریخ مختصر زبان فارسی. تهران: انتشارت طهوری.
ابوالقاسمی، محسن. (1394 ش). تاریخ زبان فارسی. تهران: سمت.
ابوالقاسمی، محسن. (1394 ش). زبان فارسی وسرگذشت آن وگفتارهای دیگر. تهران: انتشارات طهوری.
ارانسکی، یوسف م. (1386 ش). زبانهای ایرانی. (مترجم دکتر علی اشرف صادقی). تهران: انتشارات سخن.
جاوید، عبدالاحمد. (1999 ع). اوستا. سویدن: شورا فرهنگی افغانستان.
حبیبی، عبدالحی. (1395 ه ق) (چاپ 12+) دپشتو ادبیاتو تاریخ (اول اودوم ټوک). کندهار: صداقت خپرندویه تولنه.
حبیبی، عبدالحی. (1396 ه ق). مادر زبان دری. کابل: مرکز مطالعات علامه عبدالحی حبیبی.
خانلری، پرویز ناتل. (1373 ش). زبان شناسی زبان فارسی. تهران: انتشارت توس.
دارمیستتیر، گایگر، مروگنستیرن، بن ونیست. (1356 ش). تاریخ تلفظ وصرف

پشتو. (دوه جلده). (مترجم: دکتر روان فرہادی). کابل: پوہنزی ادبیات وعلوم بشری پوہنتون کابل.

شیکہر، ایندو. (1337 ش). راہنمای سنسکریت. تہران: انتشارات دانشگاہ ایران.

قویم، عبدالقیوم. سیایوف پروفیسور بیگ مراد. (1398 ش). افغانستان خاستگاہ زبان فارسی دری. کابل۔

کاکڑ، محمد حسن. (1357). افغان، افغانستان. کابل: پوہنتون کابل-پوہنزی ادبیات.

ناتل، خانلری. (1399 ش). تاریخ زبان فارسی. تہران: فرہنگ نشر نو با ہمکاری نشر آسیم.

یاسمی، رشید، بہار، ملک الشعرا، فروزانفر، بدیع الزمان، قریب، عبدالعظیم، ہمائی، جلال الدین. (1317 ش). دستور زبان فارسی پنج استا. تہران: انتشارات اشراقی.

یمین، محمد حسین. (1398 ہ). تاریخچہ زبان پارسی دری. کابل: انتشارات سعید.

کیمبرج ہیسٹری آف انڈیا: جلد اول، صفحہ 82 تاریخ افغانستان 1۔89.

ویدا، جلد دوم، صفحہ 153، سرود 22، حصہ ہشت، بیت 9.

ویدا: جلد دوم، صفحہ 26، سرود نخست، حصہ ہشت.

مطالعات افغانی ہنری، صفحہ 2.

الفنستون. مونت استوارت. (1876). گزارش سلطنت کابل: جلد اول، صفحہ 302.

☆☆☆

"Sarpat Ghoda" ka Tanqidi Mutala by Faizanur Rahman (Research Scholar,dept. of Urdu ,Magadh University, Bodhgaya)8709201533

فیضان الرحمن (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا)

''سرپٹ گھوڑا'' کا تنقیدی مطالعہ

''سرپٹ گھوڑا'' شوکت حیات کا ناولٹ ہے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا ہم اسے ناولٹ کہہ سکتے ہیں؟ کیوں کہ پہلی بار یہ تحریر ''شب خون'' جنوری 2002 میں شائع ہوئی۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس تحریر کو افسانے کے زمرے میں رکھا ہے لیکن شوکت حیات ہمیشہ اسے ناولٹ ہی کہتے رہے۔ اگر ہم ناولٹ کی تعریف پر توجہ کریں تو مختصر یعنی سو سے دو سو صفحات پر مشتمل قصہ کو ہم ناولٹ کہتے ہیں جس میں ناول کے تمام اجزائے ترکیبی موجود ہوں۔ چونکہ ہندی میں کہانی اور ناولٹ کے بیچ میں لمبی کہانی کا بھی تصور ہے جس کے صفحات 50 یا 60 تک ہوتے ہیں۔ یہ طویل کہانیاں اکثر رسالوں میں شائع ہوتی ہیں اور کئی کہانی کار کے افسانوی مجموعے چار پانچ طویل کہانیاں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن کہانی کار اسے ناولٹ نہیں کہتا تو کیا ''سرپٹ گھوڑا'' کو شوکت حیات کا ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ ناولٹ ''شب خون'' میں شائع ہوا تو ''شب خون'' کے سائز کے مطابق 17 صفحات کو محیط کرتا ہے۔ یہ ناولٹ پھر کئی رسالوں میں شائع ہوا اور شوکت حیات کی موت کے بعد صفدر امام قادری نے ''سرپٹ گھوڑا'' کو کتابی شکل میں 2022 میں شائع کیا اور یہ بتایا کہ اسے ناول یا ناولٹ کیوں کہا جائے۔

''شب خون میں ''سرپٹ گھوڑا'' کی اشاعت کے بعد رسالے کے صفحات پر ان کی

بالعموم تعریفیں ہوئیں اور اکثر لوگوں نے یہ قبول کرلیا کہ وہ ناول لکھ سکتے ہیں۔یعنی وہ افسانے کے محدود بیانیے سے نکل کر قصہ گوئی کی طویل روایت میں مداخلت کر سکتے ہیں۔دو تین برسوں کے دوران شوکت حیات نے اس ناولٹ میں جگہ جگہ اضافے کئے ۔اس کے علاوہ بڑی باریکی اورفنی کاری گری سے اس میں اپنے چار مطبوعہ افسانوں کو ناول کا حصہ بناتے ہوئے اس کی کچھ ایسی نئی شکل بنادی جسے اب ناول یا ناولٹ کہا جا سکتا تھا۔'' (1)

صفدر امام قادری کی اس رائے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں چار مطبوعہ افسانے کو ناولٹ میں جوڑا گیا اور جگہ جگہ اضافے بھی کئے گئے۔صفدر امام قادری نے اس ناولٹ کو 16 ابواب میں منقسم کیا ہے۔اگر ہم ان چار افسانوں کو ہٹا دیں تو ناولٹ پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں۔میرا خیال ہے ان چار افسانوں کا اس ناولٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم اسے افسانے کی صورت میں ہی پڑھ سکتے ہیں۔ایک بات میں یہاں واضح کردوں کہ شوکت حیات کے اندر وہ صلاحیت موجود تھی کہ ایک نہیں کئی ناول یا ناولٹ لکھ سکتے تھے یا اگر وہ چاہتے تو ''سرپٹ گھوڑا'' کو ہی بڑھا کر ناولٹ یا ناول کی شکل دے سکتے تھے جیسا کہ غضنفر نے کئی افسانوں کو بعد میں ناول بنا دیا۔شوکت حیات کو بھی یہ فن کاری آتی تھی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ایک بات اور میں یہاں واضح کردوں کہ ''سرپٹ گھوڑا'' جو ''شب خون'' میں شائع ہوا وہ ہر حال میں مکمل ہے بعد میں جو افسانے جوڑے گئے اس سے اس کی شناخت پر بھی اثر پڑتا ہے اور پلاٹ پر بھی۔اس لیے میں ''شب خون'' میں شائع ''سرپٹ گھوڑا'' کو سامنے رکھ کر ہی بات کروں گا۔

سرپٹ گھوڑا کا آغاز غالب کے ایک شعر سے ہوتا ہے وہ شعر ہے:

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس میں کل بارہ ابواب ہیں۔پہلا باب ایک ہینڈبل سے شروع ہوتا ہے جو فرقہ پرست تنظیم کی طرف سے تقسیم کیا گیا ہے جس میں ایک فرقے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ناولٹ کا

آغاز راوی سے ہوتا ہے جو راوی ایک دفتر میں ملازم ہے اور یونین کا لیڈر بھی۔اس دفتر کے ایک اسٹاف کو وہ ہینڈ بل ہاتھ لگ جاتا ہے جس میں لکھا تھا:

''جس وقت کسی لیڈر کی طرف سے تمہیں طلب کیا جائے فوراً تیار ہو جاؤ۔

راستوں میں مارچ کے دوران پٹاخے چھوڑو۔

حملہ ایسی جگہ کرو جو تمہارے اپنے علاقے سے دور ہو تا کہ لوگ تم کو پہچان نہ سکیں۔

سامنے سے حملہ ہرگز نہ کرو بلکہ ہمیشہ پیچھے سے وار کرو۔رات کی تاریکی میں فساد کی آگ زیادہ بھڑکاؤ۔

کسی بھی قیمت پر پولیس کو اس کا موقع نہ دو کہ وہ تمہارے اسلحہ پکڑ سکے۔

ان کے گھروں میں کام کرتے وقت عورتوں کو رجھانے اور پھنسانے کی کوشش کرو اور اپنے ڈنڈ بل انہیں دکھاؤ تا کہ وہ تم میں دلچسپی لیں اور پھر موقع پا کر ان کے ساتھ بدکاری کرو۔'' (2)

شوکت حیات یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ پہلے باب میں گفتگو کرنے والے ایک ہی فرقے کے لوگ تھے۔شہر کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور اس وجہ سے تمام لوگوں میں نفاق کے باوجود قربت پیدا ہوگئی تھی ۔شہر کے حالات اچھے نہیں تھے لیکن زندگی کی گاڑی کہاں رکتی ہے۔مرنے والوں کے ساتھ سارے لوگ مر تو نہیں جاتے۔سارے لوگ اس بات کے لیے فکرمند تھے کہ فسطائی طاقتوں کی سازشوں سے کیسے مقابلہ کیا جائے۔کچھ لوگ اسے ہلکے میں لے رہے تھے اور کچھ لوگ بے حد سنجیدہ تھے ان کے سامنے سوال یہ بھی تھا کہ اگر شہر میں فساد برپا ہوا تو وہ لوگ کیا کریں گے جو پاکٹس میں رہتے ہیں یا جو اغیار کے علاقے میں بکھرے پڑے ہیں تبھی ایک چپراسی راوی کو آکر بتاتا ہے کہ ایک شخص آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔آپ کے بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔وہ شخص پرزہ دے کر چلا گیا۔راوی پرزہ پڑھتا ہے جس میں لکھا تھا:

''آپ کے گھر سے بذریعہ فون آپ کی ڈیڑھ سس کے یہاں یہ خبر آئی ہے کہ آپ کے

بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔آپ کے ساڑھو گھر پر نہیں ہیں اس لئے آپ کی ڈیڑھ سس نے مجھے آپ کو دفتر میں خبر کرنے کے لئے کہا۔آپ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ناکامی ہوئی۔جیسے ہی یہ پرزہ ملے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجایئے۔آپ کی ڈیڑھ سس آپ کے گھر کے لئے نکل چکی ہیں۔خدا آپ کے بیٹے کی صحت بحال کرے۔

میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔میرا نام جان کر کیا کیجئے گا بس جلدی کیجئے۔‘‘(3)

راوی سوچتا ہے کہ صبح میں تو بچے کو اسکول بھیج کر آیا تھا۔صبح میں اس کا چہرہ مضمحل تو ضرور تھا لیکن اتنا سیریس ہو جائے گا پتہ نہ تھا۔اس کے دوست بیماری کی خبر سن کر دھیرے دھیرے فرار حاصل کرتے ہیں۔وہ نروس ہونے لگا۔ایسے حالات میں مقابلہ کیسے کرے گا۔راوی سڑک پر آ گیا اور آٹو کا انتظار کرنے لگا۔وہ بار بار اپنی بیوی اور بچے کے بارے میں سوچتا ہے۔اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور شہر کے حالات بگڑ رہے تھے۔آٹو والے بھاگ رہے تھے کوئی بھی سیٹ خالی نہیں مل رہی تھی۔اس کی بیوی چاہتی تھی کہ ایک دو بچہ اور ہو جائے لیکن اس نے پرہیز کیا۔شہر کے حالات خراب تھے اور اس کا بیٹا مصیبت میں تھا۔وہ اگلے اسٹینڈ پر جاتا ہے لیکن اسے ٹیمپو نہیں ملتا۔

شہر میں حال ہی میں فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا تھا۔حالات تو نارمل ہو گئے تھے لیکن لوگوں میں خوف طاری تھا۔اس لیے نو بجے رات کے بعد ایک دوسرے کے علاقے میں جانے سے پرہیز کرتے تھے۔ملی جلی آبادی والے علاقے محفوظ تھے۔لوگوں کا کہنا تھا کہ کوئی نہ کوئی تنظیم فساد کرانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

راوی کا بیٹا بیمار ہے اور وہ جلد سے جلد اپنے بیٹے کے پاس پہنچنا چاہتا ہے۔شہر میں ابھی بھی خوف کا ماحول تھا وہ آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔شاید کوئی اسے لفٹ دے دے لیکن گاڑی شائیں شائیں کرتی گزر جاتی۔وہ دوڑ کر اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا اسی وقت ایک ٹیمپو آیا جس پر اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ اس پر سوار ہو گیا۔وہ بار بار اپنے بچے کے

بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹیمپو اس کے گھر کے قریب رکا جب وہ گھر پر پہنچا تو اس کی بیوی لپٹ کر رونے لگی کہ منّے کو بچاؤ، اس کی بیوی نے بتایا اسکول سے لوٹتے وقت اسے بخار آ گیا اور مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ راوی کے ساڑھو پہنچ گئے تھے اور تسلی دے رہے تھے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کی ڈیڑھ سس نے ان پر ملامت بھیجا۔

''آپ بہت نظر انداز کرتے ہیں بچے کو‘ میری بہن تو کئی دنوں سے آپ کو کہہ رہی تھی کہ بچہ نحیف ولاغر ہوتا چلا جا رہا ہے اس کے چہرے پر زردی چھا رہی ہے مگر آپ نے اس کی بات کو ہمیشہ ہوا میں اڑا دیا۔ بچہ پیدا کیا ہے تو اس کا خیال تو رکھنا پڑے گا۔ پیسے کو دانت سے پکڑیئے گا تو بچے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔'' (4)

سوال یہ تھا کہ ایسے حالات میں کس ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ وہ ڈاکٹر روی کانت کو دکھانا چاہتا تھا لیکن بیوی کسی ہندو ڈاکٹر کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ زہریلے پرچے اور شہر کے حالیہ حالات کی وجہ سے وہ خوف زدہ تھی اس کی ڈیڑھ سس اور ساڑھو بھی ہندو ڈاکٹر سے علاج کرانے کے لیے راضی نہیں تھے لیکن راوی حتمی فیصلہ کرتا ہے کہ وہ روی کانت کو ہی دکھائے گا۔ وہ ڈاکٹر روی کانت کے پاس لے گئے۔ روی کانت نے معائنہ کے بعد بتایا، وائرل انفکشن ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ بخار اوپر نیچے ہوتا رہا اور بچے کو نرسنگ ہوم میں بھرتی کرنے کی نوبت آ گئی۔ اسی وقت ایک شخص آتا ہے اور بتاتا ہے کہ میرا نام لالہ سورج نندن ہے۔ آپ لوگ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اگر آپ کے پاس پیسے کی کمی ہے تو میں دے سکتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا بچہ علاج کے بغیر......اور اس نے پرس نکال کر پیسے راوی کو دے دیا۔ وہاں موجود لوگ اس کا احسان مند تھے کہ ایک اجنبی نے اس کی مدد کی۔ بار بار راوی پاکستان اور بنگلہ دیش کی دیواریں گرانے کی بات کرتا ہے وہ اجنبی بار بار ان کے سامنے آتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ بچے کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ کئی راتیں گزارنے کے بعد ڈاکٹر ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ بچہ کا بخار کم ہو جائے۔ پھر راوی

مذہبی معاملے میں الجھ جاتا ہے۔ وہاں موجود جونیئر ڈاکٹر بتاتا ہے کہ بڑے ڈاکٹر ہنومان بھگت ہیں اور لکشمی ان پر مہربان ہے۔ہم لوگوں کے پاس ایک ہی ڈگری ہے لیکن میں ان کی ہاسپیٹل میں دو ہزار کی نوکری کرر ہاہوں ۔ پھر راوی کو ہائی کورٹ کے پہلو میں بابا سید صفدر شاہ شہید کا مزار یاد آتا ہے۔ وہ ان بدعتوں کو نہیں مانتا تھا لیکن ان کے پیر مزار کی طرف بڑھتے گئے ۔راوی ترقی پسند خیال کا تھا اور وہ ان باتوں کو نہیں مانتا تھا وہ وہاں دو زانوں بیٹھا تھا وہاں کی تمام چیزیں اسے پر اسرار نظر آ رہی تھی۔ تبھی ایک ملنگ کی چیخ نے اس کے خیال کو متزلزل کر دیا اور اس کے مارکسسٹ کی ہوا باہر نکل گئی۔ یہ اقتباس دیکھئے:

’’ آخر تم بھی کہاں آ گئے ۔وہ مارکسی جدلیاتی قوت چند ساعتیں قبل اسے راحت اور یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔اس نے مارکسسٹ کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دل میں فاتحہ پڑھنا شروع کیا۔زبان ابھی اس کے قابو سے باہر تھی اور دماغ اس کا نئے سرے سے واشنگ ہو رہا تھا ۔ ہائے اس کا اپنا ذہن بھی اس کے بس میں نہیں تھا ۔اسے کیا ہو رہا تھا وہ متحیر تھا کہ مارکسزم سے متعلق ہندی اور انگریزی اصطلاحوں کے جنگل میں مدتوں گم رہنے کے باوجود قرآن کی کئی آیتیں وہ اب تک بھولا نہ تھا لیکن پوری پوری سورتیں اسے اب یاد نہ تھیں ۔ چاروں قل بھی اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھے۔سورۂ اخلاص کو جوں توں ذہن میں تازہ کر کے اور اسے کئی بار پڑھ کر اس نے کمی کا ازالہ کیا۔‘‘(5)

راوی کا بچہ بیمار ہے اس کا بخار کبھی تیز ہو جاتا ہے، کبھی کم ہو جاتا ہے ۔وہ اجنبی پھر راوی کے قریب آ جاتا ہے اور بتاتا ہے میں مستقل تیرے ساتھ ہوں اور میں وقت کا مارا ہوا ہوں ۔جب میں بالکل قلاش تھا تو کسی نے میری مدد نہیں کی ۔ڈاکٹروں نے رحم نہیں کیا اس لیے جب کسی کا اکلوتا بیٹا بیمار ہوتا ہے تو میں اس کی مدد کے لئے نکل پڑتا ہوں ۔اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پرس نکالا اور زبردستی اس کی جیب میں پیسے رکھ دیئے پھر وہ رات بھر جاگنے کی بات کرتا ہے۔راوی نے پیسہ واپس کرنے کی بات کی اور اس سے پتہ مانگا

لیکن اس نے کہا ہم فقیروں کا پتہ کیا پھر بھی اس نے ایک کاغذ پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر اس کی جیب میں ڈال دیا۔
بچے کا بخار کم زیادہ ہوتا رہا۔ جب ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو بخار کم نہیں ہو رہا تھا راوی کی بیوی نے تشویش ظاہر کی تو اس نے بتایا کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں اترے گا۔ اس کے ڈیڑھ سس اور ساڑھو کلینک سے چلے گئے اور یہ دونوں کلینک میں رہ گئے۔
دھیرے دھیرے بچے کے بخار میں کمی آنے لگی۔ اس کے بغل میں بھی ایک بچہ بیمار تھا جس کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے ہیں۔ جب دونوں بچے کی طبیعت بحال ہو جاتی ہے تو نرسنگ ہوم سے چھٹی مل جاتی ہے۔
جب حالات بہتر ہو جاتے ہیں تو پانچ سو روپیہ اکٹھا کر کے اس محسن کو اس کے بتائے ہوئے پتہ پر دینے جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بیٹے کی موت کے بعد اسے خودکشی کئے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے اب تو اس کی راکھ بھی فضا میں تحلیل ہو چکی ہوگی۔
یعنی جو محسن اس کے بچے کی بیماری کے وقت میں اس کے ساتھ کھڑا تھا اس سے ہمدردی سے پیش آ رہا تھا اور اس کا مالی تعاون کر رہا تھا وہ شخص کب کا مر چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی روحیں لوگوں کی مدد کے لیے آگے آتی ہیں جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جسے ہم اپنا محسن یا ہمدرد سمجھتے ہیں وہ اس دنیا کا نہیں ہوتا ہے وہ محسن راوی کی مدد اس لیے کرتا ہے کہ اس کا بچہ بھی بیماری کی حالت میں مر چکا تھا اس لیے وہ جب کسی بچے کو بیمار دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لئے آگے آ جاتا ہے۔
شوکت حیات نے اس ناولٹ میں پلاٹ کے بجائے سچویشن پر زیادہ زور دیا ہے۔ ہم اسے واقعاتی ناولٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ناولٹ کا آغاز ایک پمفلٹ کی تقسیم سے ہوتا ہے جس میں آزادی کے بعد سے لیکر آج تک کی سیاست کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پھر شہر میں کرفیو کا ماحول ،خوف،دہشت اور اس میں ایک بچے کا بیمار ہو جانا اور پھر بچے کے علاج کے لئے تگ و دو۔ پورا ناولٹ انہی واقعات سے شروع

ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔شوکت حیات سچویشن پر کہانی لکھنے کے ماہر ہیں وہ ایک چھوٹی سی بات سے کہانی کو شروع کرتے ہیں اور کہانی میں اتنی وسعت پیدا کر دیتے ہیں کہ کہانی بڑی ہو جاتی ہے۔شوکت حیات نے اس ناولٹ کا نام ''سرپٹ گھوڑا'' کیوں رکھا اس سلسلے میں پروفیسر صفدر امام قادری نے لکھا ہے:

''ناول کے چھٹے باب میں پہلی بار یہ گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔اس باب کا عنوان پراسرار گھوڑے کی ٹاپ رکھا گیا ہے۔چھٹے باب سے لے کر ناول کے آخر تک گھوڑے کی ٹاپ موجود ہے۔کسی بڑے فن کار کے خاص استعارے کو حتمی طور پر یہ بتادیا جائے کہ اس کا کون سا مفہوم یقینی ہے تو سچی بات یہ ہے کہ اس کا طلسم ہی ضائع ہو جائے گا۔ممکن ہے شوکت حیات کے ذہن میں سرپٹ گھوڑا اقتدار اور استحصال کی قوتوں کے شکنجے کا بتدریج حاوی ہونے کا اشاریہ ہو مگر ناول میں جس طرح رہ رہ کر سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ اور اس کی آوازوں کا بتدریج بڑھنا معلوم ہوتا رہتا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معنی شاید اس حد کو متعین کر دے۔گھوڑا طاقت کا استعارہ ہے ۔سودا نے اسے زوال کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ایم ایف حسین نے اس گھوڑے کو شہوانی قوت کے طور پر رنگوں کے امتزاج سے تیار کیا ہے۔شوکت حیات بھی اس استعارے کو کچھ اور بڑے معنوں میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ناول کے آغاز میں انہوں نے غالب کا مشہور شعر یوں ہی نہیں پیش کیا ہے۔

رو میں رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پہلا مطلب تو یہی واضح ہے کہ یہ سرپٹ گھوڑا اصل میں زندگی کی قوت ہے ۔ہار اور جیت،دوڑ اور بھاگ ان سب سے آخر ہم پائیں گے کیا اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ناول اپنی زندگی کی ہار اور جیت کی کہانی ہے اور سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ رفتہ رفتہ اور مدھم اور ختم ہونے کی نشانی ہے۔غالب کے شعر کو پیش کرتے ہوئے شوکت حیات نے اسی طرف ہمارے ذہن کو لے جانا چاہا ہے۔''(6)

''سرپٹ گھوڑا'' شوکت حیات کا پہلا اور آخری ناولٹ ہے لیکن یہ کم نہیں ہے کہ شوکت حیات نے ناولٹ کی طرف توجہ کی تھی۔ وہ ایک اور ناول لکھ رہے تھے اس کا اعلان بھی کیا تھا لیکن اس کا کیا حشر ہوا پتا نہیں اگر اس کا مسودہ ان کے گھر والوں کے پاس ہے تو اسے منظر عام پر آنا چاہئے۔

''سرپٹ گھوڑا'' میں ناولٹ کے تمام لوازم موجود ہیں اس میں کوئی واضح پلاٹ نہیں ہے بلکہ سچویشن کے ذریعہ کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے اور دنیا جہان کی سیاست کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ گھوڑا کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ گھوڑے کی ٹاپ کو، اس کی آواز کو بہت خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ میں یہاں چند اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

''دفعتاً اسے لگا کہ کہیں دور سے کوئی گھوڑا اس کی طرف سرپٹ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں گونجتی ہوئی ٹاپیں سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سرپٹ گھوڑے کے پاؤں کی دھمک بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔

اچانک سرپٹ گھوڑوں کی ٹاپ پھر سنائی دی۔ ٹاپ قریب آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کی بیوی اور بچہ گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے روندے جا رہے ہیں۔ زدوکوب کیے جا رہے ہیں۔ ان کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ سرپٹ گھوڑوں کا قافلہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ایک، دو، تین، سینکڑوں، ہزاروں انگنت ٹڈی دل کی طرح چھپائے جا رہے تھے۔ چاروں طرف غیر مرئی سرپٹ گھوڑے یہاں سے وہاں تک دندناتے پھرتے تھے اور وہ دونوں چپ چاپ اپنے وجود کے غار میں اتر کر نامعلوم سمتوں میں بھٹک رہے تھے۔

اچانک سرپٹ گھوڑوں کی پراسرار آواز پہلے دور سے اور پھر نزدیک سے آتی ہوئی سنائی دی۔

عالم دہشت میں جلتی ہوئی سگریٹ اس کی انگلیوں سے گر گئی۔ ٹیمپو میں دونوں نے مل کر جلتی ہوئی سگریٹ کو تلاش کیا۔ پراسرار ٹاپوں کی آوازیں ان کا محاصرہ کر رہی

تھیں۔''(7)

شوکت حیات کا ناولٹ'' سرپٹ گھوڑا'' پر جس طرح گفتگو ہونی چاہیے تھی نہیں ہوسکی امید ہے کہ آنے والے وقت میں اس ناولٹ پر کھل کر بات ہوگی تو یقینا افسانے کی طرح ناولٹ میں بھی ان کا نام روشن ہوگا۔

حوالہ جات:

1 شوکت حیات'' سرپٹ گھوڑا'' مرتب صفدر امام قادری صفحہ 9

2 ''شب خون'' جنوری 2003 صفحہ 31

3 ایضاً صفحہ 32

4 ایضاً صفحہ 36

5 ایضاً صفحہ 40

6 شوکت حیات'' سرپٹ گھوڑا'' مرتب صفدر امام قادری صفحہ 40-39

7 ایضاً صفحہ 25-24

☆☆☆

Afsane افسانے

Kashkol by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800

وحشی سعید (سرینگر)

کشکول

اب بھی رنگوں میں قوسِ قزح کی لکیر اپنی تمام رعنائیوں سے ابھرتی ہے۔ وہ، وہ قوسِ قزح ہے جو ابھر جاتی ہے، کھو جاتی ہے اور میں چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتا ہوں:

''تم قوسِ قزح ہو!''

وہ اپنی بڑی بڑی، موٹی موٹی آنکھوں سے خاموش رہنے کا حکم دیتی، وہی آنکھیں جن میں درد اور کرب کی پرچھائیں نظر آتی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا۔ اب۔۔۔۔اب میں اپنے آپ کو اضطراب، بے چینی، بے بسی کے عالم میں تڑپتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

وہ کتابی چہرہ اب بھی نظر کے سامنے ہے۔ جس پر دو موٹی موٹی آنکھیں سنجیدگی اور خاموشی کی پرچھائیاں معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی کمر پر بالوں کی لمبی چوٹی، اس کی صحت مند پیٹھ اور اس کے کانوں میں چمکتی اور جھولتی ہوئی بڑی بڑی بالیاں!

دو سال ہو گئے۔۔۔دو سال پہلے سبیل کے نام شادی کا لیبل لگا کر پتھروں کی دنیا میں آ گئی۔ اس دنیا کا عجیب اور بے ہودہ سا نام بھی تھا۔ پتھروں میں پتھر کی زندگی تھی۔ پتھر کے پھول تھے۔ بے حسن۔۔۔خوشبو سے عاری، اور نزاکتوں سے بے بہرہ۔ وہاں زندگی کا پھول بھی سوکھ سوکھ کر کانٹا بن جاتا ہے۔

اور یہی قوسِ قزح کی دنیا تھی!

وہ اپنی خوشبو کھو رہی تھی۔۔۔۔۔وہ جانتی تھی اور یہی احساس جان لیوا تھا۔ کاش احساس بھی مردہ ہو جاتا۔

ترتیب رکھنے والا سبیل ترتیب کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔کالج کی جوان فضا نے ہماری دوستی پر مضبوط مہر لگائی۔مگر سبیل میری بے ترتیب زندگی سے ہم آہنگی پیدا نہ کر سکا۔وہ مکانوں میں رہتا تھا۔انجینئر بن گیا۔وہ میری فاقہ مست زندگی کو کوستا تھا۔اور میں اپنی قسمت پر ناز کرتا تھا۔وہ بلو پرنٹ کی لکیروں میں کھو گیا۔لکیروں کی دنیا لکیروں تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔سبیل کو ان لکیروں کی نوک پلک درست کرنے سے غرض تھی۔ مکان گر جاتے تھے بن جاتے تھے۔یہ تو زندگی کا کاروبار تھا۔وہ مکانوں کو کھڑا کرنے والا،انجینئر تھا،ان کی اونچائی اور لمبائی سے واسطہ رکھتا تھا۔

قوس قزح لکیر نہیں تھی۔۔۔۔۔مکان نہیں تھی۔۔۔۔۔!وہ کھو گئی۔۔۔۔الجھ گئی!!

انسان انسان ہوتے ہیں۔وہ مکان نہیں ہوتے،ان میں حرارت اور جذبات ہوتے ہیں۔دل اور خواہشیں ہوتی ہیں۔ان کے مزاج اینٹ اور پتھر نہیں ہوتے۔سبیل کی دنیا میں پتھر توڑے جاتے۔گارے سے سجائے جاتے،اپنی دنیا میں اکیلی اکیلی قوس قزح۔۔۔۔اکیلی تھی،سبیل کی زندگی متوازن خط تھی۔۔۔۔

اپنی فاقہ مست زندگی نے مجھے خیالوں میں لے لیا۔میں ادیب بن گیا۔جو رنگوں کی دنیا میں رہتا۔رنگوں سے پیار کرتا،رنگوں سے لفظوں کے پیکر تراشتا۔اور وقت۔۔۔۔۔وقت انوکھا ہوتا ہے۔۔۔۔۔وقت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔سونا بنا دیا۔۔۔۔سونے سے تولا۔ادب سے اچھے پیسے وصول ہوئے۔مگر اپنی الجھی دنیا میں پیچ وخم رہے۔

۔۔۔۔۔سلجھانے والا جو نہ ملا۔مگر میں کب اس الجھی ہوئی دنیا سے خوفزدہ ہوا۔۔۔گھبرایا یا ڈر گیا۔۔۔۔مجھے اپنی وحشت سے پیار تھا،لگاؤ تھا۔

پھر ایک دن اچانک میرے ہاتھ ایک خط لگ گیا۔

یہ اینٹوں اور پتھروں کی دنیا سے آیا تھا، سبیل نے مجھے اس دنیا میں چند دنوں کے لیے آنے کی دعوت دی۔ میں جانتا تھا، وہاں رنگ تھے۔۔۔۔ اچھے بھی، برے بھی! خوبصورت اور۔۔۔۔ بھدے!۔۔۔۔۔رنگوں کی اس ترتیب میں نیلوفر، زاہدہ اور فریدہ تھیں۔ اور سبیل کو ان رنگوں کو بکھیرنے کے لیے برش چاہیے۔ میں رنگوں سے تصویروں کو ترتیب دیتا۔ پھر ایسے رنگ جو چھوئے نہیں گئے، پرکھے نہیں گئے۔ جن کی نزاکتوں اور دلفریبیوں میں کوئی الجھ نہیں گیا تھا۔ سبیل کی ان تین بہنوں میں مجھے کسی ایک کا دامن تھام لینا تھا۔۔۔۔مگر قوس قزح۔۔۔۔۔ وہ قوس تھی۔۔۔۔۔قزح تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے لاکھوں میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔قوس قزح کے سامنے ان کی نزاکتیں اور ادائیں ماند پڑ جاتیں۔ اس لیے قوس قزح دل وجگر میں اتر گئی۔ میں نے چپکے سے اس کے کان میں کہا:

''تم قوس قزح ہو۔۔۔۔!''

وہ خاموش رہی۔ خاموشی اس کا ہتھیار تھا۔ خاموشی ہی اس کا حربہ تھی۔ مگر زندگی خاموش نہیں تھی۔۔۔۔ہل چل تھی۔۔۔۔ بھاگ دوڑ تھی۔ جد و جہد تھی۔ مگر وہ کورا کاغذ تھی۔۔۔۔ میں نے چاہا۔۔۔۔۔ بہت چاہا۔۔۔۔۔ وہاں لکیریں کھینچ دوں۔۔۔۔ اتنی ساری لکیریں کہ وہ گنتے گنتے تھک جائے اور میں لکھتے لکھتے رک جاؤں۔

مگر اس کا کورا جواب سرحد کی یاددہانی کرتا تھا۔۔۔۔''تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔!''

وہ پتھروں کی دنیا میں رہتی، جہاں سمجھ بھی مردہ ہوجاتی ہے۔ اس دنیا میں پتھر لڑتے ہیں، پتھر توڑے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر دل۔۔۔۔۔ دل، گوشت کا لوتھڑا ہے۔۔۔۔۔کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں۔

میں اس سے کہتا رہا اور سمجھتا رہا کہ ماضی کی یاد میں یا مستقبل کے خوابوں میں

کھوئے رہنے سے کہیں اچھا ہے اپنے حال کو تعمیر کرو۔۔۔۔۔مگر پتھروں سے سر توڑے جاتے ہیں۔جنوں نے کب سنگ دیکھا۔

فرصت کی بات تھی۔ ورنہ فرصت کہاں۔۔۔۔۔ پتھروں کو ترتیب دیتے ہوئے خود بھی سبیل پتھر بن گیا تھا۔اور جب بھی فرصت پاتا،تو اپنی باتوں کا آغاز اس جملے سے ضرور کر دیتا۔

''تمہاری بھابھی تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔۔۔۔۔!''

میں صرف ایک رسمی جواب دیتا،الفاظ کی ترتیب نہ بدلتی۔

''میری خوش قسمتی ہے۔۔۔۔۔!''

وہ مسکرا کے کہہ دیتا۔۔۔۔۔۔

''پتھروں کی دنیا پسند آئی۔۔۔۔؟''

میں کھو جاتا تھا،الجھ جاتا تھا،زندگی کی رفتار بھول جاتا تھا۔میں کہہ جاتا۔۔۔۔

''یہاں سب پتھر ہیں!''

وہ زور کا قہقہہ لگاتا۔۔۔۔۔قوس قزح ان قہقہوں کے بادلوں میں چھپ جایا کرتی۔۔۔۔قوس قزح پتھر کا مجسمہ تھی،اس کی روح کو آزاد کرنا،اس میں حرارت بھرنا،جوانی کا احساس دلانا،وہاں روح میں جسم کی تپش کی ضرورت تھی۔۔۔۔۔

ان کے ڈرائنگ روم میں کس پیر منش کے یہ جملے بار بار میری نظروں کے سامنے آتے تھے۔

''ان لوگوں کو پاکیزہ نہیں کہا جا سکتا جو اپنے جسم کو دھو کر پاک وصاف کر لیتے ہیں۔۔۔۔حقیقت میں پاک وہ ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہے۔''

زاہدہ،نیلوفر اور فریدہ کے رنگ پھیکے پڑتے رہے۔زاہدہ شاعر تھی۔اس لحاظ سے اس کے اور میرے درمیان تعلق قائم ہوا۔ وہ مجھ سے اپنے اشعار کی اصلاح کراتی۔۔۔۔مگر میں اصلاح کی سرحد کو عبور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔حالانکہ قوس

قزح اکثر کہتی:

''ایک ادیب کی بیوی کو شاعر ہی ہونا چاہیے۔۔۔۔۔!''

اس کو کچھ دیر خاموش خاموش نگاہوں سے تکنے کے بعد میں اپنے ردعمل پر قابو پاتا۔ جیسے کوئی بہت دور کا سفر طے کر کے دم لیتا ہے۔ میں صاف اور واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیتا۔

''یہ قول مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔۔!''

وہ بھولے پن کو اپنا لیتی، انجان بن جاتی اور کہہ دیتی۔۔۔۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں!''

میں اس کو اپنا احساس دلانا چاہتا تھا، اپنی راہ بتانا چاہتا تھا۔

''کبھی کبھی میں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر کھلے ہاتھ یاد آجاتے ہیں۔۔۔۔ دامن چھڑانے کی کوشش میں اس کی زبان پر سچائی آجاتی۔۔۔۔۔۔

''ان پتھروں میں تمہارا کوئی کام نہیں۔''

کورے کاغذ پر شکن پڑ جاتی۔

پھر ایک ایسی شام بھی آئی، جو سنسان تھی۔ اس شام میں تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی درخشندہ فضا اور سیاروں کی مسلسل گردش میں فطرت سے دور اپنی نئی کہانی میں کھو گیا۔ اس کہانی نے مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا۔ مگر اس تصور کی دنیا میں زیادہ دیر نہیں بھٹک سکا۔ کسی نے دستک دی۔۔۔۔۔ وہ قوس قزح تھی!

میں نے دبی دبی آواز میں کہا:

''تم ہو قوس!''

''ہاں میں ہوں!'' اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی۔ اس کے آنے سے میرے ذہن میں تاریکی بڑھ گئی۔ جب تک وہ پردہ نہ اٹھاتی روشنی نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔ میں نے مجبوراً کہا:

''کیابات ہے؟''

اس کے چہرے پر تھکن تھی جیسے وہ لاکھوں میل طے کر کے آئی ہو۔مگر اس کے چہرے پر اضطراب کی کوئی جھلک نہ تھی۔اس نے پردرد آواز میں کہا۔

''پتھروں کی دنیا نے مجھے پتھر بنادیا ہے۔''

میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکا۔اک جنون کی آگ میرے رگ وپے میں لہراتے ہوئے ذہن پر اثر کر گئی۔میں نے کہا:

''تمھیں احساس ہوا؟''

وہ خاموش رہی۔خاموشی بڑی کربناک تھی۔وہ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔کمرے میں ٹہلتی رہی۔۔۔۔۔دائیں ہاتھ سے وہ اپنی زلفوں کو سنوارتی۔۔۔۔۔کبھی وہ اپنے ماتھے کے پسینے کے قطرے رومال سے خشک کرتی۔۔۔۔۔اچانک وہ وحشت زدہ آواز میں بول اٹھی۔

''چلے جاؤ۔۔۔۔پتھروں کی اس دنیا سے چلے جاؤ۔۔۔۔۔میں پتھر رہنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔صرف پتھر رہنا چاہتی ہوں۔۔۔۔''

کتنے ہی بت ٹوٹے، کتنے تصورات پاش پاش ہوئے۔۔۔۔میں دوڑا۔۔۔۔میں بھاگا۔۔۔۔۔

پتھروں کی دنیا سے واپس ضرور آیا لیکن پتھر نہ بن سکا۔۔۔۔۔

دل کا درد روگ بن گیا!!!

☆☆☆

Titli by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363

نورشاہ (سرینگر)

تتلی

موہنی نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ ہوا کا ایک نرم سا جھونکا اُس کے بالوں کو چھوکر آگے نکل گیا۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی۔ کنول کے لال پیلے پھول جھیل کے صاف وشفاف سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جھیل کی سطح نے ایک منعقش تھال کا روپ اپنا لیا ہو اور اُس پر قطار اندر قطار سینکڑوں دل کنول کے پھول بن کر دھڑک رہے ہوں۔ سورج ڈوب رہا تھا ڈوبتے سورج میں شفق کی لالیاں سُبک روی سے بہتی ہوئی لہروں کے ساتھ اٹکھلیاں کر رہی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی سرسراہٹ لوری کے بول کی طرح نیند میں ڈوب گئی۔ شام کے سایوں نے اپنے پر پھیلا دیے۔ اب شام آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔ جھیل کی خاموشیوں میں فتنہ جگانے کے لئے، سجے سنورے ہاؤس بوٹوں میں مہکتی زندگی کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے موہنی کو اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ ایک لمبی سی سانس لے کر وہ کھڑکی سے پلٹ آئی۔ اُسے آنے والے لمحے کا بے حد انتظار تھا۔ یہ آنے والا لمحہ اپنے ساتھ آنند کو لا رہا تھا۔ اُس نے ریڈیوگرام کا سوئچ آن کیا۔ اُس کا سر آہستہ آہستہ ہلنے لگا اور پھر خود بخود اس کے قدم سنگیت کی لے پر تھرکنے لگے......... تیزی اور تیزی سے اور جب اس کے قدم رُک گئے تو سارا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

آنند اب بھی کہیں نہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ آرام وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کئے نہ جانے کن خیالوں میں ڈوب گئی۔ آنند اور اُس میں کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ نہ وہ تیر سکتا تھا اور نہ ہی رقص وموسیقی کے ساتھ کوئی لگاؤ تھا۔ وہ ٹھہرا ایک مصور......... برش اور

رنگوں سے کھیلنے والا۔ زندگی کو اس کے حقیقی رنگ و روپ میں دیکھنے کا شیدائی۔ لیکن پھر بھی ہر شام اُس کا انتظار کرنا اب ایک معمول بن چکا تھا۔ موہنی کے ڈیڈی فارن سروسز میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے جس کی وجہ سے موہنی کو بھی بہت سارے بیرونی ممالک دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن وہ جنت بے نظیر کشمیر پہلی بار آئی تھی......... اپنے ڈیڈی کے ساتھ۔ ڈیڈی تو سرکاری کام سے آئے تھے اور اُن کا کافی وقت سرکاری کام میں صرف ہوتا تھا۔ کشمیر میں موہنی کے لئے کچھ اور نہ سہی، تیرنے کے لئے ایک خوبصورت جھیل تو تھی اور پھر آنند.........!

موہنی ایک بار پھر ریڈیوگرام کے قریب آئی، سوئچ آن کیا۔ پر سلے کی مدھر آواز میں گانا آ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا جب وہ نیوزی لینڈ گئی تھی تو ایسٹرن کلب میں یہی گانا اُسے جانی کے قریب لایا تھا۔ جانی ایک بے پرواہ لڑکا جو ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر محبت کے سوانگ رچاتا تھا۔ اُسے سٹنٹ فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ جانی کے ساتھ سنیما ہال میں بیٹھ کر گھٹیا سٹنٹ فلمیں دیکھ کر بھی اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ رومانی فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ لیکن جب کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے ملک لوٹ آئی تو بھول گئی کہ جانی نامی ایک بے پرواہ لڑکا اُس کی زندگی میں آیا تھا۔

آنند اب بھی کہیں نہ تھا۔ اُس نے سامنے تپائی پر پڑی کتاب اُٹھائی اور اس کے اوراق الٹنے لگی......... کیلو پیٹرا......... ساحل نیل کی پُر فضا، پُر کیف اور شاداب وادیوں میں بکھری ہوئی رومان سے بھرپور کہانی۔ کبھی کبھار محبت کی چنگاری کو رقابت شعلہ بنا دیتی ہے۔ یہ چنگاری موہنی کے لئے بھی ایک شعلہ بن گئی تھی۔ دلی کی بات ہے۔ ایک دن وہ اپنی عزیز ترین سہیلی مکتا سے ملنے چلی گئی تو وہاں ایک جواں سے، خوبصورت سے شخص کو مکتا کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا۔ موہنی کو دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ موہنی کچھ کہے بغیر لوٹ آئی لیکن دور تک اُسے اُن دونوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ لڑکا موہنی کے ساتھ دیکھا جانے لگا کبھی کسی ہوٹل

کے فرش پر رقص کرتے ہوءاور کبھی کسی سوئمنگ پول میں موہنی پر پانی پھینکتے ہوئے۔لیکن یہ ساتھ بالکل عارضی تھا۔موہنی نے اُسے اپنے ڈیڈ کی وساطت سے کسی کمپنی میں دلی سے بہت دور نوکری دلوادی۔شاید ایسا کرنے سے ہی اُس کے اندر پوشیدہ حسد اور قابت کی یہ آگ بجھ گئی تھی۔

آنند سے ملے ہوئے اُسے کتنے ہی دن ہوئے تھے۔اُس روز وہ پہلگام گئی تھی، اپنے ڈیڈی کے ایک ڈاکٹر دوست اوراُن کی مسز کے ساتھ۔آنند اُسے پہلگام کلب میں ملا تھا۔اُس شام موہنی نے خوب ڈانس کیا اور جب تھک کر ایک گوشے میں بیٹھ گئی تو اچانک ایک میٹھی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی.........

''آپ بہت اچھا رقص کرتی ہیں''

''موہنی نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا.................. دراز قد، چھریرا جسم بکھرے ہوئے بال، چہرے پر عجیب سا بھولا پن......... یہ آنند تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر نکل آ گئے.........

''موہنی! یہ آنند ہے، بہت معروف مصور.........شاید تم نے ان کا نام سنا ہوگا''

نہیں تو.........!''

''چلئے اب تو سن لیا''......... آنند نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی۔لنچ لیتے ہوئے اُس کا موڑ بگڑ گیا۔

''کیسی بدمزہ دال بنی ہے''

''جس کھانے کے پکانے میں عورت کا ہاتھ نہ ہو، وہ کھانا ایسے ہی بنتا ہے''......... آنند نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہاں آ کر میں کھانا بنانے لگوں.........؟ مجھے ویسے بھی کھانا بنانا نہیں آتا ہے اور مجھے کھانا بنانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ہمارے ہاں نوکر چاکر ہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ڈاکٹر انکل نے انگلی کے اشارے سے آنند کو خاموش

رہنے کی صلاح دی۔

اُس دن بھی وہ پریم کمار کی فیکٹری سے ایسے ہی چلی آئی تھی۔حالانکہ پریم کمار اُسے بہت پسند تھا۔ وہ نہ صرف ایک بہت کامیاب تیراک تھا بلکہ رقص وموسیقی میں بھی بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ جب رقص کرنے لگتا تو دیکھنے والوں کا انگ انگ تھرکنے لگتا تھا۔ پریم کمار اس کے ڈیڈ کو بھی پسند تھا لیکن جب ایک دن موہنی نے پریم کمار کو صابن بنانے والی فیکٹری میں میلے کچیلے لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھا تو اُس نے پریم کمار سے ملنا جلنا ہی ترک کردیا۔

بات پہلگام کی ہورہی ہے۔ دوسری صبح وہ گھوڑے کی سواری کررہی تھی کہ دیودار کے ایک درخت کے سائے میں آنند کو پینٹنگ کرتے ہوئے دیکھا۔نہ چاہتے ہوۓ بھی وہ رُک گئی۔گھوڑے کی لگام زور سے تھام لی اور نیچے اُتر کر آہستہ آہستہ آنند کے قریب آگئی۔

’’گڈ مارننگ‘‘......... آنند نے حسب معمول ہنستے ہوئے کہا۔

’’کیا بنا رہے ہیں آپ.........؟‘‘

’’تصویر بنانے کی سوچ رہا ہوں‘‘

’’کس کی.........؟‘‘

’’پہلے ذہن میں کچھ اور تھا۔اب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ کی تصویر بنادوں‘‘

وہ سرسبز گھاس پر بیٹھ گئی اور آنند رنگوں اور لکیروں کی دنیا میں کھوگیا۔جانے وہ کتنی دیر بیٹھی رہی۔کینواس پر بکھرے رنگوں کو دیکھتی رہی اور جب لکیروں نے صورت اپنالی تو موہنی نے اپنی صورت دیکھ کر بے حد مسرت کا اظہار کیا۔

پہلگام میں کچھ دن گزرنے کے بعد موہنی شہر سرینگر لوٹ آئی۔ ہر شام گئے آنند اُسے ملنے ہاؤس بوٹ چلا آتا۔ ہر شام وہ دونوں ایک شکارے میں بیٹھ کر پوری جھیل گھوم آتے۔ وہ اکثر آنند کے ساتھ سوئمنگ ناؤ پر جاکے تیراکی کے کپڑے پہن کر جھیل میں کود جاتی۔آنند اُسے دیکھتا رہتا۔کبھی کبھار وہ سرینگر کلب بھی ایک ساتھ جاتے جہاں موہنی

محفل رقص میں گم ہو جاتی۔ آنند ایک گوشے میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ شاید آنند کا یوں ہی خاموشی سے اُسے دیکھتے رہنا اچھا لگتا تھا، ورنہ اُن میں کوئی بھی شئے مشترک نہ تھی۔ پھر یہ کیسا قرب.........؟ یہ کیسی بے قراری.........؟

آنند اب بھی کہیں نہ تھا۔

وہ ہاؤس بوٹ کی سامنے والی کھڑکی کے قریب آئی۔ پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ شاید آنند کو دیکھنے کے لئے۔ ایک شکارا ہاؤس بوٹ کی جانب آ رہا تھا۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ اس میں آنند ہوگا۔ کھڑکی کا پردہ سلیقے سے رکھنے کے بعد وہ سنگار میز کے قریب آئی۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ ایک دلکش سراپا.........وہ خود ہی شرما سی گئی۔

دفعتاً اُس کے ڈیڈ اندر آ گئے.........

''موہنی! کہاں ہو.........؟''

''ڈیڈ آپ.........! آج آپ جلدی آ گئے''

''ہاں بیٹا.........دیکھو تو باہر کون آ گیا ہے.........!''

''آنند ہوگا اور کون.........اُس کے بغیر ہو بھی کون سکتا ہے.........!''.........اُس نے من ہی من میں سوچا۔

اور جب وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی تو وہاں آنند نہ تھا، کوئی اور تھا۔

''موہنی یہ وکرم ہے.........میرے دوست کا بیٹا۔ کل ہی کشمیر آیا ہے۔ ویسے اس کا گھر ہے یہاں۔ میں نے سوچا تم یہاں اکیلی بور ہو جاتی ہو اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کئی دنوں سے تم نے تیراکی کے لئے جھیل کا رُخ نہیں کیا۔ ڈانسنگ کے لئے کلب بھی نہیں گئی۔ وکرم تمہارا ساتھ دے سکتا ہے''

اُس نے وکرم کی جانب دیکھا.........ایک نیا چہرہ، ایک نئی پہچان۔ وکرم مسکرا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے ایک نیا چہرہ دیکھ کر اُس کی اندر کی تتلی کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ شاید رنگ رنگ کے پھولوں کی خوشبو چرانا تتلی کی فطرت میں شامل ہے.........!!!

Classification by Najma Usman (Surrey, U.K) cell-0044-7936911711
نجمہ عثمان (سرے، برطانیہ)

کلاسیفیکیشن

تو آج فیصلہ ہونا تھا۔ زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ۔ اس نے پائیں باغ کے شمالی حصے میں کھڑے ہو کر سوچا۔ پی نیز (peonies) میں اس سال پہلی دفعہ پھول کھلے تھے۔ سرخ سرخ رنگ کے گلاب نما پھول۔۔ پتلی پتلی شاخوں کے سرے پر جھوم رہے تھے۔ اوران کے بوجھ سے پی نیز کا پودا ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ اس طرف فینس کافی اونچی تھی اور پڑوس کے باغ سے سیب کے درخت کی شاخیں فینس کے ساتھ لگے ہوئے پودوں پر سایہ کئے ہوئی تھیں۔ اس نے نی پیڈ (knee pad) پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے سوچا ۔۔۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ پی نیز کو سیب کے درخت کا سایہ مل گیا۔ اگر سامنے والے حصے میں لگا دیتی تو دھوپ کی تمازت اسے جھلسا کر رکھ دیتی۔ پودوں اور درختوں کو پنپنے کے لئے موافق آب و ہوا چاہیے۔۔ اسی طرح جیسے کہ انسانوں کو جینے کے لئے۔ اس نے پی نیز کے اردگرد اگی ہوئی ویڈ (weed) صاف کرنی شروع کر دی۔ ننھے ننھے خود رو پودے جن میں پیلے رنگ کے پھول بھی نکل آئے تھے کتنی تیزی سے نکلتے اور پھیلتے تھے ان کا کراس پولینیشن (cross pollination) کتنی جلدی ہوتا تھا۔ ابھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا چند دنوں بعد پھر موجود۔

ہم جن چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں وہی ہم سے اکثر چھین لی جاتی ہیں اور بہت سی فضول اور بیکار یا دکھ پہنچانے والی، آزار دینے والی اشیاء ہماری جھولی میں ڈال دی جاتی ہیں۔۔ پودوں کے ساتھ ساتھ لاتعداد ویڈ (weed) کو دیکھ کر وہ اکثر یہی سوچتی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ باغ میں صرف وہی پیڑ پودے ہوتے جنھیں ہم شوق

سے لگاتے ہیں اور ان کی آبیاری کرتے ہیں۔۔۔دھوپ کی شدت میں کمی آرہی تھی۔ اس نے سردی محسوس کرتے ہوئے اکھاڑے ہوئے خودرو پودوں کو کالے تھیلے میں بھر دیا اور ربر کے دستانے اتارتے ہوئے پی نیز کی طرف ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔اردگرد کی زمین صاف ہونے پر پودے میں جیسے خوبصورتی اور خودنمائی اوراجاگر ہوگئی تھی۔ بریدینگ اسپیس (breathing space) ہاں شاید یہی الفاظ وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اب ان پھولوں سے لدے پودے کو اپنے اطراف گھٹن کا احساس نہ ہوگا۔گھٹن۔زندگی کی گھٹن۔۔اسے کم کرنے کے لئے وہ مسئلوں اور پریشانیوں کی کون کون سی خودرو بیلوں کی کانٹ چھانٹ کرے اور کیسے کرے؟ جب بھی کوشش کی اپنے ہی ہاتھوں کو لہولہان پایا۔اپنا ہی وجود زخمی کرلیا۔اور اس جدوجہد میں کتنے رشتے پامال ہوئے اور کتنے جذبے مجروح۔۔ان زخم زخم راستوں پر چلتے چلتے اب وہ تھکن کی آخری سرحدوں تک پہنچ چکی تھی۔بس اب اور چلانہیں جاتا۔بہت ہوگیا۔۔تصنع۔بناوٹ۔دکھاوا۔زندگی تھی کہ دوسروں کے لئے جینے کا مقصد۔ماں باپ سے چھپاؤ کہ ان کا بڑھاپا عزت وآبرو سے کٹ جائے، بچوں سے پوشیدہ رکھو کہ ان کا تابناک مستقبل تاریک نہ ہوجائے۔۔۔اور یہ فیصلے۔۔فیصلے بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔زندگی کی بساط الٹ کے پھینک دیتے ہیں۔۔۔

اس کی شادی کا فیصلہ۔۔کسی کے ساتھ باقی عمر گزارنے کا فیصلہ تو بہت جلدی میں کر دیا گیا تھا۔شاید اتنی جلدی نہ ہوتا۔فرح نے ابھی بی ایس سی کا امتحان ہی تو دیا تھا۔۔مگر اماں کو جلدی تھی۔۔بیٹی کا بوجھ سر سے اتارنے کی جلدی۔۔لیکن ابّا؟ ابّا تو کچھ سوچتے۔۔سوچ سمجھ کے فیصلہ کرتے۔۔پڑھے لکھے کامیاب بزنس مین۔عامر کے پاس برطانوی پاسپورٹ تھا اور یہ خوبی اس کی ساری برائیوں پر حاوی ہوگئی۔اور وہ بہ آسانی پڑھے لکھے لائق فائق ہنرمند داماد کے خانے میں فٹ ہوگیا۔۔۔کاش ابّا کاروبار کے علاوہ سائنس کے فلسفے کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے۔کلاسیفیکیشن کا ایک اصول یہ بھی ہے

کہ اگر متضاد خصوصیات رکھنے والی اشیاء کو اکٹھا رکھ دیا جائے تو وہ اکثر ایک دوسرے کے لئے زہر کا کام دیتی ہیں۔

اس نے دو تین لمبی لمبی سانسیں لے کر کھلی فضا کی ہوا کو اپنے اندر سمو لینا چاہا۔کیسا سکون اور طمانیت ہے اور کتنا اچھا لگ رہا ہے صاف ستھرا باغ! وہ دستانے اور کھرپی رکھ کر کچن میں آ گئی۔۔کہیں بارش نہ ہو جائے۔لندن کے موسم کی یہی تو خرابی تھی۔ یا تو موسم بہار مارچ کے وسط سے ہی شروع ہو جاتا اور یا پھر ٹپ ٹپ بارش، مئی جون تک پیچھا نہ چھوڑتی۔۔

اس نے ہاتھ دھو کر چائے کا پانی ابلنے کے لئے رکھ دیا۔ چار بج رہے تھے۔ڈیڑھ گھنٹے میں وہ بھی آ جائے گا اور پھر ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول لے کر صوفے پر ڈھیر ہو جائے گا۔اور چینل بدل بدل کر پروگرام دیکھے گا۔شروع شروع میں وہ اس کے کھیل سے بڑی محظوظ ہوتی تھی۔۔ابھی ریسلنگ ہو رہی ہے تو ابھی پاپ میوزک۔۔کبھی کسی ڈرامے کا سین تو کہیں فٹ بال۔روز روز یہی تماشا دیکھ کر وہ اس کے شغل سے بور ہونے لگی۔۔کئی دفعہ کہا بھی 'یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک پروگرام کیوں نہیں دیکھتے؟'

لیکن وہ اسکی بات ہمیشہ نظر انداز کر دیتا۔کتنا تضاد تھا ان کی طبیعتوں میں۔۔! عامر پارے کی طرح بے چین مضطرب۔۔زندگی کے ہر فیصلے کو جلدی کرنے والا اور بعد میں پچھتانے والا۔اور فرح! نرم رو ندی کی مانند پر سکون۔۔سب کچھ ہی تو متضاد تھا۔۔وہ ٹی وی کے ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتی لیکن عامر کو مار دھاڑ والی امریکن فلمیں پسند تھیں۔وہ شام کی چائے کے ساتھ دال موٹھ کھانے کی شوقین اور عامر کی شام وہسکی کے گلاس سے شروع ہوتی تھی۔فرح ہلکی خواب ناک روشنی میں بیٹھنا پسند کرتی اور وہ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی سے کمرے کو جگمگا دیتا۔'مجھے کمرے میں دھندلی روشنی اچھی نہیں لگتی' وہ جھنجھلا کر کہتا۔یہ نہیں تھا کہ فرح نے کمپرومائس (compromise)) نہیں کیا۔۔بہت کوشش کی۔تیز لائٹ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر امریکن فلمیں دیکھنا شروع

کردیں۔ البتہ شراب کی بو کی وہ عادی نہ ہوسکی ۔ وہ جب اپنے لئے وہسکی کا گلاس انڈیلتا۔وہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔

ایک ہی چھت کے نیچے وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجنبیوں کی طرح رہتے رہے۔ایک دوسرے کو سمجھنے کی خواہش میں اور الجھتے چلے گئے۔۔متضاد جذبے۔۔منفی احساسات۔۔پھر یوں ہوا کہ ان منفی جذبوں کی آبیاری بدلتے ہوئے حالات اور موسموں میں بھی اتنی پابندی اور شدت کے ساتھ ہوئی کہ اب اگر ان میں مثبت جذبے کی کوئی نئی کونپل پھوٹنے کے لئے سر اٹھاتی تو وہیں مر کے رہ جاتی۔کیکٹس کے ساتھ اگر ہار سنگھار کا پودا لگا دیا جائے تو بھلا کہاں پنپ سکتا ہے۔

بچے جب چھوٹے تھے تو انکے ارد گرد کئی مصروفیتیں ایسی تھیں جن میں دونوں میاں بیوی یکساں سنجیدگی اور شوق سے حصہ لیتے۔ان کے اسکولوں کے داخلے سے لے کر ٹرمز (terms) کی رپورٹوں تک۔۔والدین کے ساتھ منائی گئی شامیں۔۔پھر کالج کا چناؤ اور آگے یونیورسٹی کی پڑھائی۔۔لیکن ان چھوٹی چھوٹی مشترکہ خوشیوں کے علاوہ ان کی اپنی زندگی مختلف راستوں پر چل رہی تھی۔۔لندن کی بے انتہا مصروف زندگی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ویک اینڈ اور پارٹیوں کے علاوہ، بلا ضرورت اور بغیر اطلاع کوئی کسی کے گھر نہیں جاتا۔۔اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں، اکیلے میں، جب تصنع کا لبادہ اتر جاتا تو حقیقی جذبے بعض دفعہ اس سرعت سے عریاں ہوتے تھے کہ ان سے نظریں چرانا ناممکن ہو جاتا۔

اس دوران بار بار یہ سوال اٹھا۔کیا انہیں علیحدہ ہو جانا چاہیے؟ ہر دفعہ بچوں کا مستقبل آڑے آجاتا۔ وہ چھوٹے تھے تو ماں باپ دونوں ہی ان کی ضرورت تھے۔ بڑے ہوئے تو ان کی تعلیم کے زمانے میں ان پر کسی قسم کا ذہنی دباؤ ان کے لئے ضرر رساں ہوسکتا تھا۔ پھر شادی کا مرحلہ آیا اور وہ بھی بخیر وخوبی طے ہو گیا۔لڑکی شادی ہو کر اپنے میاں کے ساتھ دوبئی چلی گئی اور لڑکا بیوی کو لے کر امریکہ جا بسا۔۔

چائے بناتے ہوئے اس نے سوچا۔۔یہ پہلا موسمِ بہار تھا جو وہ بچوں کے بغیر گزاریں گے۔اب نہ جانے ایسے کتنے موسم آئیں گے اور وہ دونوں اکیلے ہونگے۔وہ چائے لے کر کمرے میں آ گئی۔اچانک ہی اسے بے تحاشا تھکن کا احساس ہوا۔اب وہ چھوٹے موٹے کاموں کے بعد بھی بہت جلدی تھک جاتی تھی۔شاید عمر کا تقاضا تھا۔۔عامر کے ریٹائرمنٹ میں بھی کچھ عرصہ رہ گیا تھا۔فرح نے وقت گزاری کے لئے کئی پارٹ ٹائم جاب کئے۔اب وہ بھی نہیں کئے جاتے تھے۔۔وہی اکتا دینے والی تھکن۔وہی زندگی کی یکسانیت۔۔۔تو اب زندگی کا سفر کیسے طے ہوگا۔؟ یہ فیصلہ انہیں آج کرنا تھا۔۔اس سے پہلے جب بھی یہ سوال اٹھا ان کا مشترکہ فیصلہ تھا۔۔۔ابھی نہیں۔۔اب جب کہ بچوں کا مستقبل محفوظ تھا۔۔وہ دونوں اس کشمکش سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔۔اس نے دکھ سے سوچا۔۔کتنی عجیب بات ہے۔۔! ازدواجی زندگی کا اتنا طویل سفر انہوں نے ایک دوسرے کو ری جیکٹ (reject) کرنے میں گزار دیا۔ کمپرومائس (compromise) ہوا لیکن کم کم۔۔اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی نہیں رہا۔وہ اب بھی چائے کے ساتھ دال موٹھ کھانے کی شوقین تھی۔یہ اور بات ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے اسے پیٹ کی کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا اور اب کھانے میں ایسی چٹ پٹی چیزوں سے احتیاط کرنی پڑتی۔عامر اب بھی وہسکی کا رسیا تھا حالانکہ ڈاکٹر نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ شراب کی کثرت اس کے ناکارہ ہوتے ہوئے جگر کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔۔۔یہ سب کچھ تھا۔۔ان کی پسند، ناپسند میں وہی تضاد رہا۔۔کبھی کبھی وہ سوچتی۔۔شاید وہ خود ہی عامر کے لئے مس فٹ (misfit) تھی۔یا شاید وہ صحرا کے کسی پودے کی طرح تھی جسے بارشوں کی زمین میں لگا دیا گیا ہو۔۔مسلسل بارش سے اس کی جڑیں اندر ہی اندر گل سڑ چلی تھیں۔اگر کبھی خشکی کا موسم ٹھہر جاتا تو اس کی جڑیں پنپنے لگتیں اور اس کے گلے ہوئے پتوں کی جگہ ایک آدھ نئی کونپل سر ابھارتی۔لیکن پھر پانی پڑنے لگتا۔۔گلنے سڑنے اور سنبھلنے کا یہ پروسیس (process) کتنے سالوں

سے چل رہا تھا۔

گھڑی نے ساڑھے پانچ بجائے اور وہ آ گیا۔ نہ جانے کیوں بہت تھکا تھکا اور نڈھال سا دکھائی دے رہا تھا۔ حسب عادت ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول لے کر بیٹھ گیا۔

'سنو! 'فرح نے کچن کے دروازے سے کھڑے کھڑے پوچھا' اگر بات کرنی ہے تو میں چائے بنالاؤں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے شراب کی بو پسند نہیں'۔

عامر اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر بھاری آواز میں بولا' آج میں کچھ نہیں پیوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں'۔ وہ عادتاً ادھر ادھر چینل بھی نہیں بدل رہا تھا۔ فرح اپنے لئے چائے لے آئی تھی۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ پھر عامر نے جمود توڑا۔۔

'میرا دوست کل امریکہ سے واپس آیا ہے ہمارے بیٹے سے مل کر آ رہا ہے۔۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔ اچھی جاب مل گئی ہے۔ اب ہم دونوں کو بلانا چاہتا ہے۔۔' پھر رک رک کر بولا۔ 'چلو گی نا! اپنے بیٹے کے پاس؟'

فرح کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سامنے والی فینس کے حصے پر ہنی سکل (honey suckle) پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور اس کی شاخوں سے ایک جنگلی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ اسے اکھاڑ پھینکا۔ لیکن وہ پھر نکل آتی اور اسی طرح ہنی سکل سے لپٹ جاتی۔۔۔ سائنس کے ہر اصول میں کہیں نہ کہیں (exception) ہے۔ شاید ہنی سکل اور اس سے لپٹی جنگلی بیل ایک دوسرے کے لئے (parasites) ہوں۔ شاید دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر پنپنا مشکل ہو۔۔

☆☆☆

Naye Ufaq ka Suragh by Wajda Nasim Gorku (Srinagar)

واجدہ تبسم گورکو (سرینگر) cell-7006834853

نئے اُفق کا سُراغ

’’آج مجھے کچھ سچائیوں سے پردہ اُٹھا لینے دو۔ پھر میں تمہارے ہر فیصلے کو تسلیم کروں گی‘‘۔۔۔۔۔۔۔۔میں نے یہ سب ذرا اُونچی آواز میں اپنے چھوٹے دیور سے بول دیا۔۔۔۔۔۔۔

’’بھابھی !۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرے بھائی جان کو بُرا مت سمجھو، وہ بالکل سچے اور شریف النفس آدمی ہیں۔ آپ کے گھر والوں نے بھی بہت زیادتیں کیں ہیں، اگر اُنہیں کسی بات کا علم تھا تو اُنہوں نے شانو کا رشتہ ہمارے گھر کے ساتھ کیوں جوڑا۔ اُنہوں نے بھی ہمیں کسی لائق نہیں چھوڑا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ لوگوں کے دِلوں پر بھی بہت کچھ گذرے گا مگر تہذیب کو اتنا نہیں گرانا چاہئے تھا کہ وہ وبال بن جائے‘‘۔۔۔۔۔۔آصف نے اپنی بھابھی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

آصف میرا دیور ہے۔ چند ماہ پہلے اُس کی منگنی میری ایک کزن سے ہوئی تھی۔ اب یہ سب کہنے کا اُس کا کیا مطلب تھا مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ویسے جب دیکھو وہ اپنی یادوں کا پٹارا کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک سلجھے ہوئے سرے کو الجھانے دُوڑے چلے آتا ہے لیکن جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آج کی یہ بات مجھے بے وزن اور بے مطلب ہی لگی تھی۔ یہ نہیں کہ اُس نے اپنے بڑے بھائی کی بڑائی کی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے گھر کا ماحول ماتمی کر دیا۔ میرا تو بُلڈ پریشر بڑھ گیا۔۔۔۔۔۔

’’ظالم ہیں یہ لوگ!۔۔۔۔۔۔ایک تو ستم کا نشانہ بناتے ہیں اور دوسرا قصور بھی نہیں

بتاتے ہیں۔ میں پُرسکون زندگی جینا چاہتی ہوں اور یہ اپنے بڑے بھائی کی ہمدردی کی نمائش کر رہا ہے۔ مجھے جھوٹی ہمدردی سے سخت نفرت ہے'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اِس لئے نہیں کہ شانو کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ میری کزن ہے بلکہ اِس لئے کہ الزام غلط لگ رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آصف نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا ۔۔۔۔۔۔۔''بھائی جان نے شانو کا رشتہ توڑ کر آپ کی توہین نہیں کی بلکہ آپ کی زندگی کا سامان کیا ہے۔ جب میں نے اِس رشتے کو آگے بڑھانے سے انکار کیا، تو مری کم سِنی اور نا سمجھی پر سب کو تشویش ہوئی'' ۔۔۔۔۔۔۔۔دیدی تو پہلے سے ہی اُس رشتے کے لئے تیار نہیں تھی پھر بعد میں ماں کے کانوں میں کچھ ایسا بھر دیا کہ وہ بھی بدظن ہو گئی۔ میں نے آپ کا مان رکھنے کے لئے ہی اِس رشتے کے لئے ہاں کیا تھا''۔

''آپ ناراض مت ہو جائیں۔ میرے بھائی نے یہ قدم سوچ سمجھ کر اُٹھایا ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ رشتہ کیوں ٹوٹا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بھابھی میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ کو ماں کے برابر مانتا ہوں۔ آپ کا حکم بھی میرے لئے ماں کے حکم کے برابر ہی ہے۔ مجھے سمجھنے کی آپ کوشش کریں'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''بے شک گھر کے ماحول میں تبدیلی آئی۔ گھر میں قیامت بر پا ہوئی، ماتم جیسا ماحول چھایا، مگر مجھے اِس رشتے سے انکار کرنا پڑا۔ بھائی جان نے ماں اور دیدی کو کہا ۔۔۔۔۔۔آپ لوگ اِس رشتے سے خوش نہیں تھے اِسی لئے توڑا۔ میں آپ اور اپنے بھائی کے رشتے میں خلیج پیدا نہیں کر سکتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری دُنیا میرے بھائی جان ہیں اُن کے بغیر میری کائنات ادھوری ہے۔ شادی تو دو دِلوں کا پاک رشتہ ہے۔ یہ زبردستی کا سودا نہیں'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ ایک طرف آصف، دیدی اور ممی کو بدنام کر رہا ہے اور دوسری جانب شانو کے خلاف جا رہا ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا مگر لے دے کے میں

نے آصف کو سچ کہنے پر مجبور کیا، کیونکہ میں دونوں طرف سے ملوث تھی۔ میرا چھوٹا دیور میرا چھوٹا بھائی جیسا ہے اور میری کزن میری چھوٹی بہن جیسی ۔میں اپنے بلڈ پریشر کواور بڑھانا نہیں چاہتی تھی، اِس لئے میں نے اپنے شوہر حیدر علی کو کمرے میں بُلایا تا کہ پورا سچ میرے سامنے آئے، یہ رُوز رُوز کی کھٹ کھٹ، پٹ پٹ سے نجات ملے اور گھر کا ماحول بھی ٹھیک ہو جائے۔ میرا تو اپنا رشتہ اِس گھر میں آج سے تقریباً دس پہلے حیدر علی سے ہوا تھا اور میری کزن شانو کا رشتہ اِس گھر سے اب ہونے والا تھا۔ اِس لئے آج کے لئے میں اپنے آنے والے کل کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے شوہر حیدر علی کمرے میں آئے، اور اُنہیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ مجھ سے نظریں نہ ملا پا رہے ہوں۔ اصل میں وہ بہت ہی شریف النفس انسان ہیں۔ اُنہوں نے کبھی بھی مجھ سے بڑے لہجے میں بات نہیں کی۔ ایک مکمل بیوی ہونے کا ہر وقت پورا احساس دیا۔ اُنہوں نے ہر میدان میں، ہر وقت میرے ہر دُکھ میں، ہر سُکھ میں ایک بہترین ساتھی کی طرح میرا ساتھ دیا۔ اُنہوں نے اوروں کی طرح کبھی مجھے پاؤں کی جوتی نہیں سمجھا۔ پیار کرنے میں تو اُن کا مجھے کوئی ثانی نظر نہیں آتا ہے۔ اُن کی اِس ادا پر تو میں آج بھی فدا ہوں۔ قدرت نے ہماری جوڑی خوب بنائی ہے۔ اللہ بھی جانتے ہیں کہ میں خاموش طبعیت کی مالک امن سے جینے والی اُنہی ہی کی بنائی ہوئی ایک شئے ہوں۔ میرے سسرال والے بھی مجھے شاید اِسی لئے بہت چاہتے ہیں، کیونکہ میں نے کبھی اُن کی کسی بات کا بُرا نہیں مانا۔ اُن کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہمارے گھر والوں کے درمیان بھی آپسی نزدیکیاں تھیں۔ ہمارے والدین ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں، میرا رشتہ بھی آپسی جان پہنچان کی وجہ سے ہی ہو گیا تھا۔ میرے شوہر حیدر علی مجھ سے سات سال بڑے ہیں اور آصف میرا دیور مجھ سے صرف تین سال چھوٹا۔ بچپن میں چونکہ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ اِس لئے مجھے معلوم تھا کہ آصف بے حد شرارتی بھی ہے۔ بات بات میں اپنی بات منوانا اور اپنے

بڑے بھائی کی شرافت کا جائز فائدہ اُٹھانا اُسکی فطرت میں شامل تھا۔۔۔۔۔۔میں جب شادی کر کے سسرال گھر آئی،تو تبدیلیوں کا آنا مناسب ہی تھا۔میرے شوہر حیدر علی میری ساس کا اپنا بیٹا نہیں ۔وہ میرے سسر کی پہلی بیوی کا اولا د تھا،مگر آصف کی ماں اور حیدر علی کی شرافت نے ایک دوسرے کو باندھے رکھا تھا۔اور میں نے بھی کبھی کوئی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔میں نے آصف اور اُس کی چھوٹی بہن کو کبھی سوتیلا نہیں سمجھا،اُنہیں بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح پیار دیا۔گھر میں دُوریاں کرنے کی کبھی نہیں سوچی۔اِسی لئے گھر والے مجھے ایک اچھی بہو اور حیدر علی بھی ایک اچھی شریکِ حیات تصّور کرتے تھے۔جس کی وجہ سے گھر کے رشتوں کے ماحول اور رُوزمرہ کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔۔۔۔۔ہماری اچھی سوجھ بوجھ سے اللہ میاں نے ہمارے گھر کو ہر نظر بد سے بچا کے رکھا ہے۔گھر میں جو کچھ بھی ہے۔

حیدر علی اُس کے برابر کے شریک تھے۔ایسا آصف کی ممی اکثر کہا کرتی ہے مگر آج آصف کے شادی سے انکار کرنے سے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔دو خاندانوں کے بیچ میں درار پڑنے والی تھی،جو نہ میں کبھی چاہتی تھی اور نہ ہی شائد آصف یا گھر کے باقی افراد۔حیدر علی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آصف اور میں ایکدم خاموش ہو گئے۔تھوڑی دیر کے لئے میں نے اُن کے ہونٹوں پر ایک دِلفریب مصنوعی مسکراہٹ تو ضرور دیکھی تھی مگر میری چپی اُسے ہزار سوال کر رہے تھے۔

''میں آپ کو صاف صاف بتاؤں گا کہ رشتہ توڑنے کے پیچھے کی وجہ کیا ہے؟''۔۔۔۔حیدر علی نے حالات کا کچھ دیر جائزہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔۔۔۔۔

''آصف کبھی دیدی کو،کبھی اماں کو اور کبھی کسی اور کو اِس کے پیچھے کا قصوروار ٹھہراتا ہے مگر ایسا بالکل نہیں ہے۔اصل وجہ یہ ہے کہ آصف نے شانوں کو مشتاق کے ساتھ جو اُس کا ممیرا بھائی بھی ہے ایک ریستوران میں لنچ کرتے ہوئے دیکھا۔پھر جب آصف نے شانو سے پوچھا تو وہ حیلے اور بہانے ڈھونڈنے لگی۔پہلے بولا۔۔۔۔۔۔۔یہ میرا بھائی

ہے، پھر بولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ میری سہیلی کا فرینڈ ہ ہے۔ اُن دونوں کا آپس میں کچھ جھگڑا ہوا ہے اور اب میں صلح صفائی کرنے کے لئے اِسے ملی ہوں، وغیرہ، وغیرہ۔۔چونکہ آصف مشتاق کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُس نے یہی سوال مشتاق سے کیا۔آپ دونوں یہاں ایک ساتھ کیسے ۔۔۔۔۔۔۔تو اُس نے بھی کوئی مثبت جواب نہیں دیا، بلکہ کہا''۔۔۔۔۔۔۔

''دیکھیئے!۔۔۔۔۔شانو اور میں ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ قریبی دوست بھی ہیں۔ اِس لئے کبھی کبھی ایک دوسرے سے یہاں ملنے آتے ہی رہتے ہیں۔اِس میں کیا برائی ہے اور آپ یہ سب ہم سے کیوں پوچھ رہے ہیں''۔۔۔۔۔چونکہ آصف کو کئی دِنوں سے میں نے پریشان دیکھا۔ وہ کبھی سر کُھجلاتا تھا، کبھی بات کو ٹال دیتا تھا اور کبھی بھائی کسی دِن آپ کو بتاؤں گا کہہ کر مجھے ہر بار چپ کراتا تھا۔اب جب پچھلے دو دنوں سے یہ کسی سے کھل کر بات بھی نہیں کرتا ہے، نہ ڈھنگ سے کھاتا ہے اور نہ ڈھنگ سے اٹھتا بیٹھتا ہے۔آج پکڑ کے زور زبردستی کی، تو بولا۔۔۔۔۔۔۔

''بھائی جان بات یہ ہے کہ شانو کو میں نے مشتاق کے ساتھ دیکھا۔ وہ اُسکا میرا بھائی تو ضرور ہے مگر وہ دونوں ریستوران میں کیوں جاتے ہیں جبکہ یہ ایک بھائی بہن کی طرح گھر میں بھی مل سکتے ہیں اگر ریستوران گئے بھی تو میرے پوچھنے پر بہانے کیوں بنانے لگے۔۔۔۔۔۔۔؟۔میں اُسے اب جڑا ہوں، کل کو کوئی اونچ نیچ ہو جائے گا تو دونوں خاندانوں کی بدنامی ہوسکتی ہے۔پھر میں نے مشتاق سے خود مل کر پوچھا، تو اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔آپ کی بیوی یعنی آپ نے یہ رشتہ زبردستی آصف سے جوڑا ہے۔اِس لئے میں نے یہ رشتہ توڑنا ہی مناسب سمجھا، کیونکہ آج کا یہ زبردستی کا رتہ دو خاندانوں کو کل رسوا بھی کرسکتا ہے اور ہمارا دس برس کا جڑا رشتہ بھی ٹوٹ سکتا ہے''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''میں نے یہ رشتہ توڑ کر پہلے دو خاندانوں کو رسوا ہونے سے بچانا ہے اور پھر اپنے رشتے کو جو دس برس

پہلے جڑا ہے کیونکہ آپ اب اکیلی نہیں ہیں ایک بچے کی ماں بھی ہیں۔آصف آپ کی بہت عزت کرتا ہے وہ آپ کا دل توڑنا نہیں چاہتا ہے، اِسی لئے کبھی ایک جھوٹ اور کبھی دوسرے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، اور ہاں!۔۔۔۔۔۔۔۔اب جبکہ میں نے آپ کو پوری حقیقت بتائی، اب فیصلہ آپ پر ہے۔۔۔کہہ کر چپ ہوگئے‘‘۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

’’بس حیدر صاحب!۔۔۔۔بس!۔۔۔۔۔آپ مجھے اور شرمندہ مت کیجئے۔آپ کا فصیلہ میرے سر آنکھوں پر، آصف میرا چھوٹا بھائی ہی نہیں، میں اُسے اپنا بڑا بیٹا سمجھتی ہوں۔آج آپ نے واقعی نہ صرف بڑے بھائی کا فرض نبھایا بلکہ ایک اچھے شوہر ہونے کا بھی ثبوت دیا۔ مجھے صرف آپ سے ہی نہیں، بلکہ اِس گھر اور گھر کے تمام افرادخانہ سے محبت ہے ۔میں اِسے کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی ہوں۔مجھے معاف کریں ‘‘۔۔۔۔۔۔۔یہ کہتے کہتے میری آنکھوں کے بہتے اشکوں نے مجھے ایک ہلکان بخش کر ایک نئے اُفق کے سورج کا سراغ دیا۔۔۔

☆☆☆